





# مسلمانان اور جوہ کشمکش

مسلمانان اور جوہ کشمکش  
کشمکش

۱۶

تالیف

۴۴ / سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رساله " ترجمان القرآن "

جمال پور ، پٹنہا کورٹ



# تفہیمات

بعض معرکہ الارام مسائل اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدہ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حدیث و رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شہادت کا لزالہ وغیرہ۔  
حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔  
قیمت بے جلد ۲ روپے ۸ آنے علاوہ معصودا

# تنقید

یہ مولف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جنہیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان الجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۴۴ صفحات۔ قیمت فہر مجلد دو روپے چار آنے علاوہ معصودا



No:- 237

Cost :- Rs 6/5

# مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ سوم

از

ابوالاعلیٰ مودودی  
ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر ترجمان القرآن - دارالاسلام جمالیہ - متصل پٹھان کوٹ

محصول ڈاک ۴۴

قیمت بے جلد ۱۱/۴

(بار سوم دو ہزار)



# فہرست مضامین

۳	مقدمہ -
۹	تعارف مقصد -
۱۹	تحریک اسلامی کا منزل -
۳۲	نسلی مسلمانوں کے لیے دورا ہیں -
۴۴	اقلیت و اکثریت -
۵۰	شکایات -
۶۰	راہ روپشت بمنزل -
۷۰	اسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین -
۸۴	اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہ عمل -
۹۴	اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں -
۱۲۵	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ -
۱۵۸	ایک صالح جماعت کی ضرورت -
۱۷۱	دستور جماعت اسلامی -



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## مقدمہ

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے عنوان سے میرے مضامین کے مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اب اسی سلسلہ کا یہ تیسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ بظاہر پہلے دونوں مجموعوں سے اس تیسرے مجموعہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں یوں محسوس کرے گا کہ میں نے حصہ دوم کی شاعت کے بعد سے یکایک اپنی پوزیشن بدل دی ہے اور خود اپنی ہیئت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگا ہوں۔ لیکن دراصل ان تینوں مجموعوں میں ایک نصب العین کی طرف تدریجی ارتقار ہے جس کی توضیح یہاں کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ناظرین کو کسی قسم کا خلجان پیش نہ آئے۔

یہ بات تھوڑے غور و تامل سے ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا کام کسی نئی تحریک کی ابتداء کرنے کی بہ نسبت زیادہ دشوار اور زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ نئی تحریک پیش کرنے والے کا راستہ تو بالکل صاف ہوتا ہے۔ اسے صرف اُن لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو اس تحریک سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ اس کو محض اپنے اصول و مقاصد کی تبلیغ کرنی ہوتی ہے۔ پھر یا تو لوگ اس کی دعوت کو رد کر دیتے ہیں یا قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن جو کسی پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنا چاہے اس کے لیے صرف یہی ایک کام نہیں ہوتا کہ بیگانوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرے بلکہ اسے بیگانوں پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ وہ ان لوگوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا جو پہلے سے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں اور بہر حال بیگانوں کی بہ نسبت اس سے قریب تر ہیں۔ اس کو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انحطاط کا عمل ان کے اندر کہاں تک ہو چکا ہے اور اصل تحریک کا اثر کس حد تک ان میں باقی ہے۔ پھر اسے یہ فکر کرنی پڑتی ہے کہ جس حد تک بھی وہ دور نکل گئے ہیں اس سے آگے نہ جانے پائیں، اور جو کچھ اثر ان کے اندر باقی



ہے وہ محفوظ رہے۔ ان کی حیثیت اس تحریک کے حق میں بالکل اس سرمایہ کی معیشت ہے جو کسی شخص کے پاس بچا کھچا باقی رہ گیا ہو، اور ظاہر ہے کہ ایک عقلمند آدمی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اس کا ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ لہذا اس کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اس تحریک کے ساتھ لوگوں کی وابستگی جیسی کچھ بھی ہر دست ہے اس کو کم از کم اسی حد پر برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور اس کو مزید اضمحلال سے روکے۔ تحفظ کی اس تدبیر میں کسی حد تک کامیاب ہو جانے کے بعد اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ انہیں موجودہ حالت پر بھی نہ ٹھہرنے دے بلکہ اصل تحریک کی طرف ان کو کھینچنے کی کوشش کرے اور کسی دوسری چیز کو ان کا نصب العین ادا ان کی کوششوں کا مرکز و محور نہ بننے دے۔ اتنے مرحلوں سے گزر کر پھر کہیں اس کے لیے دعوے عام کا موقع آتا ہے اور وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے ایک نئی تحریک پیش کرنے والے کا کام شروع ہوتا ہے۔

چونکہ میرے پیش نظر تحریک اسلامی کا اجراء ہے اس لیے مجھے بھی اسی تدریج کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنی پڑی ہے جس کی طرف ادب اشارہ کیا گیا ہے۔ ترجمان القرآن کی زندگی کے ابتدائی چار سال اس کوشش میں صرف ہوئے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں گمراہی کی جو شکلیں پیدا ہو گئی ہیں ان پر گرفت کی جائے اور اسلام سے جو روز افزوں بُعد ان میں پیدا ہو رہا ہے اُسے روکا جائے۔ ابھی یہ کوشش جاری تھی کہ مسئلہ میں یکایک یہ خطرہ سامنے آگیا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اس وطنی قومیت کی تحریک کے شکار نہ ہو جائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ یہ ظاہرات ہے کہ ہم موجودہ ظالمانہ نظام حکومت کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں، اور ہمارے دل میں اس کے پیچھے سے نکلنے کی خواہش چاہے۔ کانگریسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اس وقت تک تھوڑے یا بہت اسلام کے حلقہ اثر میں ہیں ان کو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی رابطہ عوام کی تدبیر دل سے، اور اپنی وردھیا سکیم اور ودیا مندر اسکیم کے ذریعہ سے، اور اپنے سیاسی و معاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کر لے، اور ان کے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کر دے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندوستان کی آبادی میں اسلام اتنا ہی اجنبی ہو کر رہ جائے جتنا جاپان یا امریکہ میں ہے۔ اس خطرہ کو اور زیادہ پریشان کن جس چیز نے

۱۔ میری کتاب "تتقیات" اسی کوشش کا آئینہ ہے۔



بنادیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ بااثر طبقہ وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اس چیز کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیں کہ اس تحریک کا فروغ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔ لہذا اس خطرے کا سدباب کرنے کے لیے میں نے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۱۹۳۷ء کے آخر میں اور پھر دوسرا سلسلہ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں شائع کیا۔ ان مجموعوں میں میرے پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ مسلمان کم از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبے سے نیچے نہ جانے پائیں اور اپنے تشخص کو گم نہ کر دیں۔ اس لیے میں نے ان کے اندر اسلامی قومیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی، ان کو اس جمہوری لادینی نظام حکومت کے نقصانات سے آگاہ کیا جو واحد قومیت کے مفروضہ پر ہندوستان میں قائم کیا جا رہا تھا، ان آئینی تحفظات اور بنیادی حقوق کی حقیقت واضح کی جن پر اعتماد کر کے مسلمان اس جملک جمہوری دستور کے جال میں پھنسنے کے لیے آمادہ ہو رہے تھے، اور ان کے سامنے "شبہ دام لا اسلام" کا نصب العین پیش کیا تاکہ کسی نصب العین کے موجود نہ ہونے سے خیالات اور اعمال کی جو پراگندگی ان کے اندر پیدا ہو گئی ہے وہ بھی دور ہو اور ان کو نظر جانے کے لیے ایک ایسا مطمح نظر بھی مل جائے جو نہ تو اصل اسلامی سمت سے ہٹا ہوا ہو اور نہ اتنا زیادہ بلند ہو کہ اس کی بلندی کو دیکھ کر ان کی ہمتیں پست ہو جائیں۔

اس وقت چونکہ تحفظ کا کام مقدم تھا اس لیے میں نے آزادی، قومیت، قومی تہذیب، حکومت خود اختیاری، اقلیت و اکثریت وغیرہ کے متعلق رائج الوقت تصورات کے خلاف کچھ کہنے سے قصد احتراز کیا، اور ان الفاظ کے جو مفہومات ذہنوں میں راسخ تھے ان کو جوں کا توں قبول کر کے اُسی زبان میں گفتگو کی جس کو لوگ سمجھ سکتے تھے۔ اسی طرح میں نے مطلوب اصلی سے بحث کرنے کے بجائے حالت واقعی تک اپنی بحث کو محدود رکھنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ دونوں چیزوں کو بیک وقت پیش کرنے سے دماغ پراگندہ نہ ہو جائیں اور ایک ہی چمکانگ میں مقصد بعید تک پہنچنے کی کوشش کہیں مقصد قریب کے بھی ہاتھ سے جانے کی موجب نہ بن جائے۔

یہ کام جس غرض کے لیے کیا گیا تھا اللہ کے فضل و کرم سے وہ پچھلے دو تین سال میں حاصل ہو چکی ہے اور اب



اس امر کا کوئی خطرہ باقی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی وطنی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دیں گے یا اپنے آپ کو کسی ایسے جمہوری نظام میں تھپی کرالیں گے جو واحد قومیت کے مفروضہ پر تعمیر کیا گیا ہو۔ یہ جو کچھ ہوا کسی انسانی کوشش سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوا۔ اسی کی ہر بانی سے متعدد اسباب ایسے پیدا ہوئے جن کی بدولت مسلمان اس خطرے سے بچنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سلسلہ میں جن جن لوگوں کو اس نے تھوڑی بہت خدمت کی تو فیق بخشی ان کے لیے فخر کا مقام نہیں بلکہ شکر کا مقام ہے۔

اس مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد اب میرے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ آیا مسلمانوں کو اس نتیجہ پر مطمئن ہو جانے دیا جائے جو حاصل ہو چکا ہے یا ان میں مزید بے چینی پیدا کر کے انھیں اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی جائے؟ آیا مسلمانوں کو سیاست و اجتماع کے انھی غلط تصورات میں مبتلا رہنے دیا جائے جو مغربی جاہلیت سے انھوں نے سیکھے ہیں یا ان کے سامنے اسلام کے اجتماعی و سیاسی تصورات کو صرف علمی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک عملی مطمح نظر کی حیثیت سے بھی پیش کر دیا جائے؟ آیا مسلمانوں کو محض اپنی انفرادیت کے منبھاتے ہی میں لگا رہنے دیا جائے یا انھیں یہ بتایا جائے کہ تمھاری انفرادیت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم تر مقصد کے لیے مطلوب ہے؟ یہ سوال سامنے آتے ہی میرے ضمیر نے قطعی فیصلہ صادر کیا کہ پہلی شق غلط ہے اور صرف دوسری شق ہی صحیح ہے۔ چنانچہ اگر کوئی دوسرا سبب نہ پیش آتا تب بھی مجھے وہ کام کرنا ہی تھا جو میں نے کیا۔ لیکن بد قسمتی سے اس کے ساتھ دو مزید وجوہ ایسے پیدا ہو گئے جنھوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ حصہ دوم کی اشاعت کے فوراً بعد ہی اُن مضامین کا سلسلہ شروع کر دوں جن کا مجموعہ اس وقت بدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے:

پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نئی تحریک کے دور میں عامۃً مسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لیے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اُس قدر قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے۔ یہ براہ راست نتیجہ ہے علماء کرام کی اس غلط سیاسی روش کا جس پر وہ ابھی تک برابر اصرار کیے چلے جا رہے



ہیں، اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علماء دین سے ہٹ کر اس شدت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقف دین رہنماؤں پر نہیں جاتا تھا۔ میرے نزدیک یہ صورت حال اسلام کے لیے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ میرے نے اگر اپنی جو ہریت ہی کھودی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم نجات پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے اس نئی تحریک کے اندر داعیہ دینی کے بجائے داعیہ قومی کو بہت زیادہ کار فرما دیکھا۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں، لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جز اتنا کم اور قوم پرستانہ جز اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہال جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں! اس حد کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہ عظیم ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مستحکم جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے افراد میں بہر حال کوئی ایک مشترک وفاداری پیدا کرنا کافی ہے، خواہ وہ خدا کی وفاداری ہو یا قوم کی یا وطن کی۔ اس لحاظ سے جن لوگوں کو محض جماعتی استحکام مطلوب ہے ان کے لیے تو یہ امر کسی تشویش کا موجب نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں میں خدا کے بجائے قوم کی مشترک وفاداری سے یہ مقصد حاصل ہو لیکن ہم خدا پر ایمان رکھنے والوں کو آخر کس زمین میں پناہ اور کس آسمان کے نیچے سر چھپانے کی جگہ ملے گی اگر ہم بھی خدا کے ان بندوں کو خدا کے بجائے کسی اور کی مشترک وفاداری پر مجتمع ہوتے دیکھتے رہیں اور کچھ نہ بولیں۔

یہ ہیں وہ محرکات جن کے تحت اس مجموعہ کے مضمین لکھے گئے ہیں۔ میں نے ان مضامین میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں پر اور کہیں کہیں ان کے لیڈروں پر بھی صاف صاف تنقید کی ہے، مگر خدا شاہد ہے کہ کسی شخصیت یا کسی پارٹی



سے مجھے کو کوئی ذاتی عداوت نہیں ہے۔ میں صرف حق کا دوست اور باطل کا دشمن ہوں جس چیز کو میں نے حق سمجھا ہے اس کے حق ہونے کی دلیل بیان کر دی ہے اور جسے باطل سمجھا ہے اس کے بطلان پر بھی اپنے دلائل بیان کر دیے ہیں۔ اگر کوئی شخص مجھ سے اختلاف رکھتا ہو اور وہ دلیل سے میری رائے کی غلطی واضح کر دے تو میں اپنی رائے واپس لے سکتا ہوں۔ رہے وہ حضرات جو صرف یہ دیکھ کر کہ کچھ ان کی پارٹی یا ان کی محبوب شخصیتوں کے خلاف کہا گیا ہے غضبناک ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے کچھ بحث نہیں کرتے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے یا باطل، تو ایسے لوگوں کی اور ان کے غیظ و غضب کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں نہ ان کی گالیوں کا جواب دوں گا اور نہ اپنے طریقہ ہی سے ہٹوں گا۔

الوالا علی



## تعارف مقصد

قوانین فطرت سب کے سب بلا استثناء دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ جو آج سے لاکھوں برس پہلے جوقانون کی تابع تھی، اسی کی تابع آج بھی ہے اور اسی کی تابع قیامت تک رہے گی۔ زمانہ کے تغیرات کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ روشنی اور حرارت کے لیے جو قانون دنیا کے ایک حصہ میں ہے وہی دوسرے حصہ میں بھی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا کہ مشرق میں حرارت کی ماحیت و کیفیت کچھ اور ہو اور مغرب میں کچھ اور۔ شمال میں روشنی ایک رفتار سے چلے اور جنوب میں دوسری رفتار سے۔ اشیاء کے بننے اور بگڑنے، بڑھنے اور گھٹنے، پیدا ہونے اور فنا ہو جانے کے لیے جو قوانین مقرر ہیں ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔ ان میں کوئی رعایت، کوئی لاگ، پیرہ، کوئی جانبداری نہیں۔ باقی باقی قدرت کا کسی کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ وہ کسی کی دوست اور کسی کی دشمن نہیں۔ کسی پر مہربانی اور کسی پر نا مہربانی نہیں۔ جو آگ میں ہاتھ ڈالے گا، جل جائے گا۔ جو برکھائے گا، مر جائے گا۔ جو غذا کھائے گا، موت اور تشویر مناسپ ہے گا۔ فطرت کے حدود و فرمانروائی میں یہ ممکن نہیں کہ دیاسنی کی رگڑ سے ایک کے لیے آگ کا شعاع پیدا ہو اور دوسرے کے لیے پانی کی دھار۔

انسان جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے وہ بھی اسی فطرت کا ایک کشتی ہے جو ماری کائنات پر حاوی ہے، لہذا انسانی فطرت کے قوانین بھی فطرت کائنات کی طرح دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ زمانہ کے تغیرات سے مظاہرین خود کتنا ہی تغیر ہو جائے، حقائق میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ ہم اور وہم میں جو فرق آج سے دس ہزار برس پہلے تھا وہی آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا۔ ظلم اور عدل کی جو حقیقت دو ہزار برس قبل سچ تھی وہی دو ہزار برس بعد سچ رہتی ہے۔ جو چیز حق ہے، وہ چین میں بھی درست ہے، جیسے امریکہ میں ہے، اور جو چیز باطل ہے وہ کسے کے لیے بھی اسی طرح باطل ہے جس طرح گورے کے لیے ہے۔ انسان کی مساوت و برابری اور فلاح و خیران کے لیے فطرت کا قانون



تعلقاً بے لاگ ہے۔ اس میں کسی شخص، کسی قوم، کسی نسل کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ اسباب سعادت اور اسباب شقاوت کے لیے یکساں ہیں۔ جو شقاوت کے اسباب فراہم کرے گا وہ محض اس بنا پر سعادت سے ہم کنار نہیں ہو سکتا کہ اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل یا قوم سے ہے۔ اور اسی طرح جو سعادت کے اسباب فراہم کرے گا وہ بھی محض اس بنا پر اپنے کسب کے ثمرات سے محروم نہ رکھا جائیگا کہ وہ غلام نسل سے تعلق رکھتا ہے یا فلاں نام سے موسوم ہے۔

فطرت انسانی کے اس دائمی، عالمگیر اور بے لاگ قانون ہی کا دوسرا نام اسلام ہے۔ اس کو انسان پر منکشف کرنے والا وہی فاطر کائنات ہے جس نے انسان کی اور سارے جہان کی فطرت بنائی ہے۔ یہ کسی قوم پرست کا تعیل نہیں ہے جو ساری دنیا کو اپنی قوم کے مفاد و مصالح کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ کسی طبقاتی لیڈر کی پرواز فکر بھی نہیں ہے جو سارے معاملات پر ایک طبقہ کے نقطہ نظر سے نگاہ ڈالتا ہے۔ فی الجملہ یہ کسی انسان کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں ہے کہ کسی خاص عہد کا کسی خاص ماحول کا اور کسی خاص شخص یا گروہ کی دلچسپیوں کا مفید ہو۔ یہ تو درحقیقت رب العالمین کی ہدایت سے ماخوذ ہے، اور رب العالمین وہ ہے جس کی نگاہ میں سب انسان یکساں ہیں۔ وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتا ہے نہ کہ ہندی اور جرمن اور اطالین کی حیثیت سے، یا فرد اور کسان اور سرمایہ دار کی حیثیت سے۔ اس کو اشخاص اور اقوام سے دلچسپی نہیں بلکہ محض انسان سے ہے۔ اس لیے وہ دیانت، اخلاق اور مذہبیت فاضلہ کے جتنے اصول بتاتا ہے وہ سب کے سب ہر قسم کی محدودیتوں سے پاک ہیں۔ ان میں بحیثیت مجموعی تمام انسانوں کی فلاح و بہبود اور زندگی کے ہر مرحلہ میں ان کی کامیابی مد نظر رکھی گئی ہے۔ وہ فطرت کے تمام دوسرے قوانین کی طرح عالمگیر ہیں۔ ان کا کسی شخص یا قوم کے ساتھ کوئی مخصوص رشتہ نہیں ہے جو کسی دوسرے شخص یا قوم کے ساتھ نہ ہو سکتا ہو۔ جو کوئی بھی ان اصولوں کو قبول کرے ان کے مطابق عمل کرے گا، فلاح پائے گا، خواہ رومی ہو یا حبشی، آریہ نسل سے تعلق رکھتا ہو یا سامی نسل سے، امریکہ میں رہتا ہو یا ایشیا میں۔ اور جو ان اصولوں سے انحراف کرے گا، نقصان اٹھائے گا، خواہ وہ کسی پینیر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔



اسلام کے انھی عالمگیر اصولوں پر انسانی حیات کی تعمیر کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے جو اسلام کی صداقت پر

ایمان لائے۔ اور چونکہ ہم اس ہمایمان لائے ہیں اس لیے یہی ہماری تمام کوششیں کا مقصد اصلی ہے۔

مگر جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد سب سے پہلے اپنے وطن کو اور بالآخر تمام دنیا کو دارالاسلام بنانا ہے تو اس سے ایک ناواقف آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جس طرح ہر جو شیلا قوم پرست زمین میں اپنی قوم کا غلبہ اور تسلط چاہتا ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی قوم کو غالب اور حکمران دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی قوم نہیں پیدا ہوئے ہیں اس لیے مسلمانوں کی حکومت ان کا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوئے ہوتے تو مونچے اور سادہ کر بننے۔ جرمنی میں پیدا ہوئے ہوتے تو ہٹلر اور گوبیرنگ کے رنگ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اٹالوی کی آغوش محبت میں جنم لیتے تو موسولینی کی صورت اختیار کرتے۔

یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ دارالاسلام کو دارالمسلمین کا ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ دونوں میں حقیقتاً بڑا فرق ہے۔ جو لوگ کلمہ گو ہونے کی وجہ سے "دائرۃ اسلام" میں داخل ہیں، اور معاشرت کے اعتبار سے مسلمانوں میں شمار کیے جاتے ہیں وہ اگر غیر اسلامی طریقوں پر حکومت کریں، تو ان کی حکومت مسلمانوں کی حکومت تو ضرور کہلائے گی کہ اتفاق سے حکمران کلمہ گو ہیں، مگر ایسی حکومت اسلامی حکومت ہرگز نہ ہوگی اور نہ اس پر صحیح معنوں میں "دارالاسلام" کا اطلاق ہو سکے گا۔ حافظ وکلاء، ہمارا نصب العین ایسی مسلمان حکومت کا قیام ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حیثیت سے ہم اپنی قوم کی بڑائی چاہیں، اور اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ محض فوق طاقت سے منہ حکومت پر قبضہ کر کے زمین کی دولت اور فرمانروائی کے تکبر کو اپنی قوم کے لیے مخصوص کر لیں تو خود اسلام ہی سب سے پہلے آگے بڑھ کر ہم کو ظالم اور مفسد ٹھیرائے گا کیونکہ وہ صاف کہتا ہے کہ:-

يَتْلُوَنَّ اللَّهُ آسْرَ الْآخِرَةِ نَجْمًا بِالَّذِينَ لَا

آخرت میں عزت کا مقام ہم نے صرف انھی لوگوں کے لیے رکھا

يُرِيدُونَ مَلُؤَانِي كَلَامُ خَيْرٍ وَلَا فَسَادًا-

سب جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کا راہ رکھتے ہیں

درحقیقت جو چیز ہمارے پیش نظر ہے وہ مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ اسلام کی حکومت ہے، اسی اسلام کی



جو مجموعہ ہے دیانت، اخلاق اور مدنیت فاضلہ کے عالمگیر اصولوں کا۔ یہ اسلام ہماری یا کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں ہے۔ اس کا کسی سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ جو ان اصولوں پر ایمان لائے اور ان پر عمل کرے وہی اسلام کا علمبردار ہے۔ وہ اگر نسل کے اعتبار سے چار یا بھنگی بھی ہو تو محمد رسول اللہ کی منہ خطا نسبت پر ٹیٹھ سکتا ہے۔ وہ اگر نکمہ جسمانی بھی ہو تو عرب و عجم کے شرفاوار و سادات کا امام بن سکتا ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے جن کے خاندان میں اسلام چلا آرہا ہے وہ اگر آج ان اصولوں سے منحرف ہو جائیں تو اسلام میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اور کل تک جو شخص ہندو یا عیسائی یا پارسی تھا، شرک اور بت پرستی، شراب اور سود اور قمار بازی میں مبتلا تھا، وہی اگر آج اسلام کی فطری صداقتوں کو مان کر عملاً ان کا پابند ہو جائے تو اس کے لیے اسلام میں عزت اور بزرگی کے اونچے اونچے مراتب تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

اس مختصر توضیح سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارا مقصد ایک قوم پر دوسری قوم کی برتری نہیں ہے، بلکہ نظام تمدن کو ان اصولوں پر مرتب کرنا ہے جو ہمارے ضمیر و ایمان کے مطابق صحیح ہیں۔ اس پر اگر کوئی ناک بھوں پڑے تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کے پاس آخر وجوہ اعتراض کیا ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ کسی مسلک کا تنقیدی یا تحقیقی مطالعہ کر کے اس امر کا اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ اس میں انسانیت کی فلاح اور انسانی تعلقات و معاملات کی بہتری کمال درجہ پر موجود ہے تو اس کے اند فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جس اجتماعی زندگی سے خود اس کا تعلق ہے جس سوسائٹی کے ساتھ اس کی زندگی و موت وابستہ ہے جس حصہ انسانیت کے ساتھ وہ تمدنی، سیاسی اور معاشی تعلقات میں جکڑا ہوا ہے، سب سے پہلے اسی کے نظام حیات کو اس مسلک کے مطابق بنانے کی کوشش کرے۔ اُسے اپنے اس پسندیدہ مسلک کے صحیح و مفید ہونے کا جتنا زیادہ یقین ہوگا، اور اس کے دل میں حب انسانیت یا حب وطن کا جذبہ جتنا زیادہ قوی ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے بنائے ہوئے وطن کو اس مسلک حق کے فوائد سے بہرہ مند کرنے کے لیے بے چین ہوگا جس میں وہ ان کی فلاح و بہبود اور کامرانی و خوشحالی سے غور و کجیتا ہے، اور اتنا ہی زیادہ شدت کے ساتھ وہ ان مسلکوں کی



حکمرانی کا مخالف ہو گا جن کو وہ پورے یقین کے ساتھ غلط اور نقصان دہ سمجھتا ہے۔ یہ عین انسانی فطرت کا مقتضا ہے اور اس میں کوئی بات خلاف حرب وطن و Unpatriotic نہیں ہے۔ بلکہ خلاف حب وطن تو یہ بات ہے کہ آدمی جس ملک کو ایمان داری کے ساتھ جو چاہے فلاح سمجھتا ہو اس کو خاموشی کے ساتھ اپنے دل میں یا اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور جن طریقوں کو وہ ایمان داری کے ساتھ نقصان رسا سمجھتا ہو انہیں اپنے اپنے لئے وطن کی زندگی پر مسلط ہونے دے۔

جن لوگوں نے مغرب کے جمہوری نظام کا مطالعہ کیا اور اسے اپنے نزدیک برحق پایا وہ تج کو شش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے نظام تمدن کو مغربی ڈیموکریسی کے نمونہ پر ڈھالیں جن لوگوں نے سرشارم کا مطالعہ کیا اور اسے برحق پایا وہ آج کو شش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی اجتماعی تعمیر نو Social Reconstruction، مائیکسی اشتراکیت کے طریقہ پر ہو یہ آخر کیوں ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی محبت اس کے سوا پیش کی جاسکتی ہے کہ ان کے ایمان و اعتقاد کا مقتضا یہی ہے؟ کیا ان کے اس اقدام کو کوئی شخص خلاف حرب وطن یا خلاف حرب انسانیت کہہ سکتا ہے؟ کیا ان کے حق میں یہ راستبازی ہوگی کہ وہ جس ملک کو اپنے اپنے جنس کے لیے سعادت و فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اس کو رائج کرنے کی جدوجہد نہ کریں اور کسی ایسے نظام زندگی کی حکمرانی کو گوارا کر لیں جو ان کے نزدیک باشندگان ملک کو بستی اور بد حالی کی طرف لے جانے والا ہو، اگر بالفرض ملک کی آزادی اور اقوام عالم کے درمیان اہل وطن کی عزت بڑھنے کا امکان کسی شخص یا استبدادی حکومت کے قیام یا سرمایہ دارانہ نظام کے بقا میں ہو تو کیا کسی سچے جیہ پرست پسند یا کسی راستباز اشتراکی سے آزادی اور وطن کی عزت کے نام پر اپیل کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مسکوں کو تھپوڑ کر اس طریقہ کو قبول کریں؟ اور کیا ان دونوں کو اس قسم کی اپیل سن کر واقعی متحیر و ڈال دینا چاہیے؟

ہاں! یہی پوزیشن ہماری بھی ہے۔ ہم کو جو چیز دارالاسلام کی سزا بلند کرے پر مجبور کرتی ہے وہ بعینہ وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو جمہوریت اور اشتراکیت کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہم نے برسوں اسلام کا



تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کیا۔ ہم نے اس کی اعتقادی اساس، اس کے نظریہ حیات، اس کے اصول اخلاق، اس کے نظام تمدن، اس کے قوانین معاشرت و معیشت، اس کے آئین سیاست و طرز حکومت، غرض اس کی ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ ہم نے دنیا کے دوسرے اجتماعی نظریات اور تمدنی مسلکوں کو کھنگال کر دیکھا اور اسلام سے ان کا تعال کیا۔ اس تمام مطالعہ اور تحقیق و تنقید نے ہمیں اس امر پر پوری طرح مطمئن کر دیا کہ انسان کے نیچے حقیقی فلاح و سعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے اس کے مقابلہ میں ہر مسلک ناقص ہے۔ کسی دوسرے مسلک کی اخلاقی بنیاد صالح اور مستحکم نہیں کسی دوسرے مسلک میں انسان کی شخصیت کے ارتقاء و Development

of Personality کا پورا موقع نہیں کسی دوسرے مسلک میں اجتماعی عدل Social Justice اور بین الانسانی تعلقات کا صحیح توازن Balance نہیں کسی دوسرے مسلک میں فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کی متناسب رعایت نہیں۔ اسلام کے سوا کوئی مسلک دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو انسان کو حقیقی آزادی سے ہم کنار کرتا ہو، اسے غربت کے بلند ترین مدارج کی طرف لے جاتا ہو، اور ایک ایسا اجتماعی ماحول پیدا کرتا ہو جس میں ہر شخص اپنی قوت و استعداد Capacity کے مطابق اخلاقی، روحانی اور مادی ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ سکے اور ساتھ ہی اپنے دوسرے بنائے جنس کے لیے بھی ایسی ہی ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اطمینان اور یقین حاصل ہو جانے کے بعد ہمارے لیے راستبازی کا تقاضا کیا ہے؟ کیا بالکل وہی نہیں جو ہمارے جمہوریت پسند یا اشتراکیت پسند بنائے جنس کے لیے ہے؟ جس مسلک اجتماعی کو ہم پوری دیانت کے ساتھ اپنائیت کے لیے رحمت سمجھتے ہیں، کیا ہم پر یہ فرض مائد نہیں ہو جاتا کہ اپنے ملک اور اپنے بنائے نوع کی اجتماعی زندگی کو اسی مسلک کے مطابق منظم کرنے کی جدوجہد کریں؟ جو چیز جمہوریت پسندوں اور اشتراکیت پسندوں کے لیے حق ہے وہ ہمارے لیے کیوں غیر حق ہے؟

اسلام کے متعلق ہماری یہ رائے کچھ اس وجہ سے نہیں کہ ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں، اور اسلام کے حق میں ایک طرح کا پیدائشی میلان رکھتے ہیں۔ اپنے دوسرے رفقاء کے متعلق تو ہم نہیں کہہ سکتا کہ ان کا کیا حال ہے،



مگر اپنی ذات کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو جس صورت میں نے اپنے گرد پیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا میرے  
یہ اس میں کوئی کشش نہ تھی بتقدیر تحقیق کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اس بے  
روح مذہبیت کا فلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اسی مذہب کا نام  
ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج لڑاؤ اور لڑاؤ مذہبوں میں جا ملا ہوتا، کیونکہ میرے اندر بازی  
فلسفہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے کہ محض حیات قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکر میں پڑا رہوں۔ لیکن جس چیز  
نے مجھے اتحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی سلک کو قبول کرنے سے روکا اور از سر نو مسلمان بنایا وہ قرآن  
اور سیرت محمدی کا مطالعہ تھا۔ اس نے مجھے انسانیت کی اصلی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اس نے آزادی کے  
اس تصور سے مجھے روشناس کیا جس کی بندی تک دنیا کے کسی بڑے سے بڑے بزل اور انقلابی کا تصور بھی نہیں  
پہنچ سکتا۔ اس نے انفرادی جن سیرت اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا نقشہ میرے سامنے پیش کیا جس سے بہتر کوئی نقشہ  
میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے تجویز کردہ لائحہ زندگی (Scheme of Life) میں مجھے ویسا ہی کمال درجہ کا توازن  
(Balance) نظر آیا جیسا کہ ایک سالمہ (Atom) کی بندش سے لے کر اجرام فلکی کے قانون جذب و کشش  
تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے اور اسی چیز نے مجھے قائل کر دیا کہ یہ نظام اسلامی بھی اسی حکیم کا بنایا  
ہوا ہے جس نے اس جہان ارض و سما کو عدل اور حق کے ساتھ بنایا ہے۔

پس حقیقت میں ایک تو مسلم ہوں۔ خوب جانچ کر اور پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے  
دل و دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے یہ فلاح و صلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔ میں  
صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد  
اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور مٹ گئی ہے،  
بلکہ یہ دعوت اس بات کی طرف ہے کہ آؤ ہم اس ظلم و ظغیان کو ختم کر دیں جو دنیا میں پھیل ہوا ہے، انسان پر  
انسان کی فدا کی کوٹھا دیں اور مسلمان کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں جس میں انسان کے لیے بحیثیت انسان



کے شرف و عزت ہو، حریت اور مساوات ہو، عدل اور احسان ہو۔

بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں جانناٹ نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ کا نام سنتے ہی ایک شخص کا ذہن فوراً دوٹ بڑھانے کی کوشش اور سیاسی غلبہ (Domination) کی خواہش اور اس قبیل کی بہت سی دوسری چیزوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف جمہوری طرز حکومت کے قیام نے سیاسی طاقت اور اس کے تمام ضمنی فوائد کو دوٹوں کی کثرت پر منحصر کر دیا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی پوزیشن یہاں کچھ ایسی ہے کہ ان کی جانب سے اپنے ملک کو پھیلانے کی کوئی کوشش اس شبہ سے نہیں بچ سکتی کہ یہ حوصلہ مند (Ambitious) قوم اب اس راستہ سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان شبہات کو قوت پہنچانے میں خود مسلمانوں کا اپنا بھی کافی حصہ ہے۔ ان کے بہت سے غلط نمائندوں نے تبلیغ تبلیغ کا شور کچھ اس طرح بلند کیا کہ گویا یہ محض ایک سیاسی حربہ ہے جسے اس جمہوری دور میں صرف اس غرض کے لیے استعمال کرنا چاہیے کہ اپنی قلت تعداد کے پیچیدہ مسئلے کو حل کیا جائے۔ اس چیز نے اسلام کے راستے میں ایک شدید قسم کا سیاسی تعصب حائل کر دیا ہے۔ موشلزم، کمیونزم، فاشلزم یا اور کسی ازم کی تبلیغ کجائے تو لوگ اس کو محض اس کے ذاتی اوصاف (Merits) کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اگر ان کے دماغ کو وہ اپیل کرتا ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔ مگر اسلام ازم کا نام آتے ہی لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ ہمارے ملک کی ایک ایسی قوم کا مسلک ہے جو پہلے یہاں حکومت کر چکی ہے اور اس جمہوری دور میں قبیل التقاعد ہونے کی وجہ سے اپنے دوٹ بڑھانا چاہتی ہے تاکہ نمائندہ مجالس کی نشستوں اور ذمہ داری ملازمت کی کرسیوں پر قبضہ کرے۔ یہ خیال آتے ہی دل و دماغ پر قومی تعصب کے قفل چڑھ جاتے ہیں اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے جانچنے پر کھنسنے کا سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

میں ان حالات کا بڑے صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ نیکی اور صداقت کی راہ میں ہمیشہ مشکلات پیش ہوتی ہی رہی ہیں، شیطان فی راہیں آسان ہوتی ہیں اور حق کی راہ بہر حال عوارض سے بہرہ ریز ہوتی ہے۔ محض صبر،



لگاتار سعی اور خالصتہ وجہ اللہ کام کرنے سے ہم مسلمانوں کے دل بھی بدل سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے دل بھی۔ جب ہماری سعی و جہد میں خدا کی خوشنودی اور بنی نوع انسان کی خیر خواہی کے سوا کسی ذیوی غرض کا شائبہ تک نہ ہوگا تو لوگوں کے دل خود بخود اس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ اسلام کسی نسل اور قوم کی میراث نہیں ہے بلکہ ایک انسانی مسلک ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ویسا ہی عام ہے جیسا ہوا اور پانی کا تعلق سب سے ہے۔ اس میں ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ جس طرح مسلمانوں کی چیز ہے اُسی طرح تمھاری بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اگر نیکی اور تقویٰ اور قانون الہی کی اطاعت میں تم نسلی مسلمانوں سے بڑھ جاؤ تو امامت تم کو ملے گی، تقدم اور شرف تم کو حاصل ہوگا، خلافت کے امین تم ہو گے اور نسلی مسلمان پیچھے رہ جائیں گے۔ یہاں برہمنیت اور نسل پرستی نہیں ہے کہ عزت و شرف اور قوت و اقتدار پر کسی خاص گروہ کا دوامی اجارہ ہو۔ یہاں ایک قوم پر دوسری قوم کے غلبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تبلیغ اسلام کی نوعیت اچھوت ادھار کی سی نہیں ہے کہ ایک قوم محض دوسری قوم کے دوٹ بڑھانے کے لیے اس کی جزر بنائی جائے مگر زندگی کی حناع میں اُسے برابر کا حصہ نہ دیا جائے۔ اسلام میں تو برابر ہی نہیں بلکہ اپنے اوصاف ذاتی کے لحاظ سے ایک شخص زیادہ کا حصہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں پیدائش کی وجہ سے آدمی اور آدمی میں کوئی امتیاز نہیں۔ کسی شخص کی راہ میں اس کے پیشے یا اس کی قومیت کی وجہ سے کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ تم اپنے کیر کڑ اور اپنے کردار کے زور سے جہاں تک اُڑنے کی طاقت رکھتے ہو اُڑ سکتے ہو۔ فرش سے عرش تک تمھاری ترقی کی راہ میں کوئی روک نہیں۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بھی کھلتا ہے کہ اسلام تیرہ چودہ صدی پہلے کا ایک مذہب ہے، اس کو آج ایک فکری و اخلاقی اور تمدنی و سیاسی تحریک کی حیثیت سے زندہ کرنے کا کونسا موقع ہے؟ جو لوگ دور سے کسی چیز کو محض سرسری نظر ہی سے دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں ان کی رائے عموماً غلط ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی غلطی یہ لوگ بھی کر رہے ہیں۔ انھوں نے قرآن کا غائر نظر سے مطالعہ نہیں کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ



اسلم کی زندگی پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی۔ اس لیے محض قیاسی مفروضات کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اسلام اب سے تیرہ سو برس پہلے کی ایک مذہبی تحریک تھی جو اس زمانہ کے مخصوص تمدنی حالات میں نو بلاشبہ مفید ثابت ہوئی مگر اب حالات بہت بدل چکے ہیں، اس زمانہ کے حالات میں وہ پُرانا مسلک کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔ اس غلط فہمی کے پیدا ہونے اور جڑ پکڑنے میں خود مسلمانوں کے اپنے طرز عمل کا بھی بہت کچھ دخل ہے، انھوں نے خود بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسے ایک تحریک Movement کے بجائے محض زمانہ سلف کی ایک مقدس میراث بنا کر رکھ دیا۔ حالانکہ ایک سلیم الفطرت آدمی اگر اپنے زمانہ سے تاریخی اور سیاسی قصبات اور پیشگی مفروضات کو نکال کر اسلام کا سائنٹفک مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت باسانی منکشف ہو سکتی ہے کہ اسلام کسی خاص زمانہ کی مذہبی تحریک نہیں ہے جس کی بنیاد وقتی اور مکانی حالات پر ہو۔ بلکہ یہ ایسے اصول کا مجموعہ ہے جو انسانی فطرت کے حقائق پر مبنی ہیں اور عام قوانین فطری کے ساتھ کامل موافقت (Harmony) رکھتے ہیں۔ انسان کے حالات اور خیالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں، مگر اس کی فطرت ہر حال میں جوں کی توں رہتی ہے۔ زمانہ خواہ کتنے ہی پلٹے کھائے، ہر حال کائنات فطرت کے حقائق اور قوانین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ لہذا جو فطری اصول طوفانِ نوح کے وقت انسانی زندگی کے لیے مفید تھے وہی اس بیسویں صدی عیسوی میں بھی مفید ہیں، اور وہی سترہویں صدی عیسوی میں بھی مندرجہ سعادۃ کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہوں گے۔ تغیر جو کچھ بھی ہوگا ان فطری اصولوں میں نہیں بلکہ بدلنے والے حالات پر ان کے انطباق (Application) میں ہوگا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام اجتہاد ہے، یعنی اصولوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر قانون کی سیرٹ کے مطابق نئے حالات پر منطبق کرنا۔ اور یہ اجتہاد ہی وہ چیز ہے جو نظامِ اسلامی کو ایک محرک و متحرک (Dynamic) نظام بناتا ہے اور اس کے قوانین کو حالات و ضروریات کے مطابق مرتب (Adjust) کرتا رہتا ہے۔



# تحریک اسلامی کا منزل

دنیا میں جب کوئی تحریک کسی اخلاقی یا اجتماعی یا سیاسی مقصد کو لے کر اٹھتی ہے تو اس کی طرف مہم سی لوگ رجوع کرتے ہیں جن کے ذہن کو اس تحریک کے مقاصد اور اس کے اصول اپیل کرتے ہیں جن کی طبیعتیں اس کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں جن کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہی تحریک صحیح اور معقول ہے، اور جو اپنے نفس کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کو چلانے اور دنیا میں قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے سوا باقی تمام لوگ جن کی طبیعت کی اقتاد اس تحریک کے مقاصد اور اصولوں سے مختلف ہوتی ہے۔ پہلے ہی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اس کے دائرے میں آنے والے لائے نہیں جاتے بلکہ خود آتے ہیں۔ انہیں کوئی چیز مجبور کر کے خواہ مخواہ اس میں داخل نہیں کر دیتی۔ نہ کوئی طاقت انہیں لا کر اس میں چھوڑ جاتی ہے جیسے کوئی کسی اندھے کو جھگڑ میں لے جا کر چھوڑ دے اور اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کس لیے لایا گیا ہوں، بلکہ وہ اسے جانے کر، پرکھ کر، سمجھ کر پورے شعور اور کامل قصد کے ساتھ آتے ہیں، اور جب آجاتے ہیں تو اس کے مقصد کو اپنا مقصد بنا کر کام کرتے ہیں کیونکہ وہی مقصد ان کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اصولوں کو ڈھینے اصول بنا کر چلتے ہیں کیونکہ ان اصولوں کو صحیح و برحق سمجھ کر ہی وہ اس میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اس تحریک کو چلانا زندگی کا مشن بن جاتا ہے کیونکہ جو چیز ان سے ان کا بچھڑا مسلک و مشرب چھڑاتی ہے اور ان کو اس نئے مسلک کی طرف کھینچ کر لاتی ہے وہ دراصل ان کے قلب و روح کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ یہی مسلک حق اور راست ہے۔ دراصل اس تحریک میں ان پر حق منکشف ہوتا ہے۔ اس کا انکشاف ہی ان کو اس تحریک کی طرف کھینچتا ہے۔ اور انکشاف حق کی نعمت ہے کہ وہ آدمی کو کبھی اس مقام پر نہیں ٹھہرے دیکھا جہاں وہ اس انکشاف سے پہلے تھا، بلکہ وہ اسے کشاں کشاں اس مقام کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس تحریک



کی صداقت کے معترف ہو کر اسے قبول کرتے ہیں ان کی زندگیوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جن کی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاتی۔ وہ اپنے اصولوں کی خاطر دوستیوں اور خونی و قلمی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار، اپنی پوزیشن، اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں، حتیٰ کہ قید و بند کی تکالیف اور موت کے خطرات تک سہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ان کی عادات بدل جاتی ہیں، ان کے خصائل میں تغیر آ جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی شکل، صورت، لباس، خوراک اور عام طرز زندگی پر بھی اس کے اثرات ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ گروہ و پیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔

ہر تحریک کی ابتداء یوں ہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے وہ جماعت بنتی ہے جو اسے چلانے کے لیے اٹھتی ہے۔ اس کے مقاصد اور اس کے اصول خود ہی آدمیوں کی اُس بھیر میں سے، جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اپنے مطلب کے آدمی چھانٹتے ہیں، اور صرف انہی لوگوں کو اس تحریک کے دائرے میں لاتے ہیں جنہیں اس سے مناسبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں ان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد بھی اسی مسلک پر اٹھے جس کو خود انہوں نے حق پا کر قبول کیا ہے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی نئی نسلوں پر تعلیم، تربیت، گھر کی زندگی اور باہر کے ماحول سے اس قسم کے اثرات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے خیالات، اخلاق، عادات اور خصائل ہر کے سہ اس مسلک کی روح اور اس کے اصولوں کے مطابق ڈھل جائیں۔ اس میں انہیں ایک حد تک کامیابی ہوتی ہے، مگر بس ایک حد تک ہی ہوتی ہے۔ پوری کامیابی ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت اور سوسائٹی کے ماحول اور خاندانی روایات کو طوائف کے ڈھانے میں بہت کچھ دخل حاصل ہے، مگر فطرت، دماغ کی ساخت، مزاج کی پیداواری افتاد بھی ایک اہم چیز ہے، اور حقیقت



میں دیکھا جائے تو بنیادی چیز یہی ہے۔ فطری طور پر دنیا میں ہر قسم کے آدمی، ہر مزاج، ہر رجحان، ہر ساخت آدمی ہمیشہ پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح اس تحریک کے ظہور کے وقت ہر طرح کے آدمی دنیا میں موجود تھے، اور ان سب سے اس کو قبل نہیں کر لیا تھا بلکہ صرف وہی اس کی طرف کھینچے تھے جو اس سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے، اسی طرح بعد میں بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے حامیوں کی نسل سے پیدا ہوں گے انہیں لامحالہ اس تحریک سے مناسبت ہی ہوگی۔ اُن میں ابو جہل اور ابو لہب بھی ہوں گے۔ عمر اور خالد بھی ہوں گے اور ابو بکرؓ بھی ہوں گے۔ جس طرح آزر کے گھر میں ابراہیم حنیف پیدا ہو سکتا ہے اُسی طرح فرخ کے گھر میں عمل غیر صالح بھی پیدا ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ قانون فطرت کے مطابق یہ امر لازمی ہے کہ اس سوسائٹی سے باہر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اپنے مزاج کی اقتداد اور اپنی طبیعت کے رجحان کے لحاظ سے اس کے ساتھ مناسبت نہ رکھتے ہوں، اور خود اس کے اندر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اس کے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ پس یہ ضروری نہیں کہ تعلیم و تربیت کا وہ نظام جو تحریک کے ابتدائی حامی آئندہ نسلوں کے لیے قائم کرتے ہیں وہ اُن کی پوری نئی پود کو ان کے مسلک کا حقیقی تمیغ بنا دے۔

اس خطرے کے سد باب اور تحریک کو اس کے بنیادی اصولوں پر برقرار رکھنے کے لیے دو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ جو لوگ تعلیم و تربیت اور اجتماعی ماحول کی تاثیرات کے باوجود ناکارہ نکلیں، تہفہ کے ذریعہ سے ان کو جماعت سے خارج کر دیا جائے، اور اس طرح جماعت کو غیر مناسب عناصر سے پاک کیا جاتا رہے۔ دوسرے یہ کہ تبلیغ کے ذریعہ سے جماعت میں ان نئے لوگوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رہے جو رجحان و ذہنیت کے اعتبار سے اس تحریک کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور جن کو اس کے اصول و مقاصد اسی طرح اپیل کریں

۱۔ موجودہ زمانہ کی تحریکوں میں اسی چیز کو "Purke" سے خیر کیا جاتا ہے اور تمام جماعتیں نامناسب آدمیوں کو اپنے دائرے سے خارج کرتی رہتی ہیں۔ بلکہ جماعت کے اصولوں سے غلامیہ مٹانے والوں کو قتل تک کر دیا جاتا ہے۔



جس طرح ابتدائی پیروں کو انھوں نے اپیل کیا تھا۔

یہ اور صرف یہی دو صورتیں ایسی ہیں جو کسی تحریک کو زوال سے اور کسی جماعت یا پارٹی کو انحطاط سے بچا سکتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ ان دونوں تدبیروں کی اہمیت غافل ہوتے جاتے ہیں۔ جماعت کے باہر سے نئے لوگوں کو اندر لانے کی کوشش کم ہونے لگتی ہے۔ جماعت کی افزائش کے لیے تمام نئی ذراکتیں ہی پر عمل کر دیا جاتا ہے اور جو لوگ اس طرح جماعت کے اندر پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ناکارہ لوگوں کو خارج کرنے میں بھی خوبی رشتوں اور معاشرتی تعلقات اور دنیوی مصلحتوں کی خاطر تاہل برتا جاتا ہے۔ طرح طرح کے بہانوں سے جماعتی مسلک میں ایسی گنجائشیں نکالی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے رطب و یابس اس میں سما سکیں۔ اور اس مسلک کو اتنا وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سرے سے اس کے سرحدی نشانات اور امتیازی حدود باقی ہی نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ بھانت بھانت کے آدمی اس جماعت کے دائرے میں جمع ہو جاتے ہیں جن کو کسی قسم کی مناسبت اس کے مسلک سے، اس کے اصولوں سے اور اس کے مقاصد سے نہیں ہوتی۔

پھر جب جماعت میں اس کے اصولوں سے حقیقی مناسبت رکھنے والے کم اور مناسبت نہ رکھنے والے زیادہ ہو جاتے ہیں تو اجتماعی ماحول اور تعلیم و تربیت کا نظام بھی بگڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سر نئی نسل پہلے کی نسل سے بدتر اٹھتی ہے۔ جماعت کا قیام۔ دربروز تنزل و انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس مسلک کا اور ان اصول و مقاصد کا تصور بالکل ہی ناپید ہو جاتا ہے جن پر ابتدا میں وہ جماعت بنی تھی۔ اس مقام پر پہنچ کر حقیقت میں جماعت ختم ہو جاتی ہے اور محض ایک نسلی اور معاشرتی قومیت اس کی جگہ لیتی ہے۔ وہ نام جو ابتدا میں ایک تحریک کے علمبرداروں کے لیے بولا جاتا تھا، اس کو وہ لوگ استعمال کرنے لگتے ہیں جو اس تحریک کو مٹانے والے اور اس کے جھنڈے کو سرنگوں کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ نام جو ایک مقصد اور ایک اصول کے ساتھ وابستہ تھا، وہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملنے لگتا ہے۔ بلحاظ اس کے کہ جب زادے کی زندگی کے اصول اور مقاصد اس نام سے کوئی مناسبت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کے ہاتھ



میں پہنچ کر وہ نام اپنی معنویت کھودیتا ہے۔ وہ خود بھول جاتے ہیں اور دنیا بھی بھول جاتی ہے کہ یہ نام کسی مقصد کسی مسلک کسی اصول کے ساتھ وابستہ ہے، بے معنی و مفہوم نہیں ہے۔

اسلام اس وقت اسی آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے۔ مسلمان کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے، اور اس کے طرز عمل نے دنیا کو بھی یہ بات بھلا دی ہے کہ اسلام اصل میں ایک تحریک کا نام ہے جو دنیا میں ایک مقصد اور کچھ اصول لے کر اٹھی تھی، اور مسلمان کا لفظ اس جماعت کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اس کی علمبرداری کے لیے بنائی گئی تھی۔ تحریک گم ہو گئی۔ اس کا مقصد فراموش کر دیا گیا۔ اس کے اصولوں کو ایک ایک کر کے توڑا گیا۔ اور اس کا نام اپنی تمام معنویت کھودینے کے بعد اب محض ایک نسلی و معاشرتی قومیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مدیہ ہے کہ اسے ان مواقع پر بھی بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے جہاں اسلام کا مقصد پامال ہوتا ہے، جہاں اس کے اصول توڑے جاتے ہیں، جہاں اسلام کے بجائے غیر اسلام ہوتا ہے۔

بازاروں میں جاییے "مسلمان زڈیاں" آپ کو کوٹھوں پر بٹھی نظر آئیں گی اور مسلمان زانی "گشت لگاتے" ملیں گے۔ جیل خانوں کا معائنہ کیجیے "مسلمان چوروں"، "مسلمان ڈاکوؤں" اور "مسلمان بدعاشوں" سے آپ کا تعارف ہو گا۔ دفتروں اور عدالتوں کے چکر لگائیے۔ رشوت خواری، جھوٹی شہادت، جیل، فریب، ظلم اور ہر قسم کے اخلاقی جرائم کے ساتھ آپ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگا ہوا پائیں گے۔ سوسائٹی میں پھر یہ کہیں آپ کی ملاقات مسلمان شریعوں سے ہو گی۔ کہیں آپ کو "مسلمان قمار باز" ملیں گے کہیں "مسلمان سازندوں" اور "مسلمان گویوں" اور مسلمان بھانڈوں سے آپ دوچار ہوں گے۔ بھلا غور تو کیجیے، یہ لفظ مسلمان کتنا ذلیل کر دیا گیا ہے اور کن کن صفات کے ساتھ جمع ہو رہا ہے۔ مسلمان اور زانی، مسلمان اور شرابی، مسلمان اور قمار باز، مسلمان اور رشوت خور! اگر وہ سب کچھ ہر ایک کا ترکہ کر سکتا ہے وہی ایک مسلمان بھی کرنے لگے تو پھر مسلمان کے وجود کی دنیا میں حاجت ہی کیا ہے؟ اسلام تو نام ہی اس تحریک کا تھا جو دنیا سے ساری بدعاشدہا قیوں کو مٹانے کے لیے



اٹھی تھی۔ اس نے تو مسلمان کے نام سے اُن چیدہ آدمیوں کی جماعت بنائی تھی جو خود بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اصلاح اخلاق کے علمبردار بنیں۔ اس نے اپنی جماعت میں ہاتھ کاٹنے کی، پتھر مارا کر ہلاک کرنے کی، کوڑے برسا کر کھال اڑا دینے کی، حتیٰ کہ سولی پر چڑھا دینے کی ہولناک سزائیں اسی لیے تو مقرر کی تھیں کہ جو جماعت دینا سے زنا کو مٹانے اُٹھی ہے خود اس میں کوئی زانی نہ پایا جائے، جس کا کام شراب کا استیصال ہے وہ خود شراب خواروں کے وجود سے خالی ہو، جسے چوری اور ڈاکہ کا خاتمہ کرنا ہے خود اس میں کوئی چور اور ڈاکو نہ ہو۔ اس کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جنہیں دینا کی اصلاح کرنی ہے وہ دنیا بھر سے زیادہ نیک سیرت، عالی مرتبہ اور باوقار لوگ ہوں۔ اسی لیے قمار بازی، جھلسازی، اور رشوت خواری تو درکنار، اس نے اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی مسلمان سا زندہ اور گویا ہو، کیونکہ مصلحین اخلاق کے مرتبہ سے یہ بھی گری ہوئی چیز ہے جس اسلام نے ایسی سخت قیود اور اتنے شدید ڈسپلن کے ساتھ اپنی تحریک اٹھائی تھی، اور جس نے اپنی جماعت میں چھانٹ چھانٹ کر بلند ترین کیڑے کوڑے کے آدمیوں کو بھرتی کیا تھا، اس کی رسوائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ رٹدی اور بھڑوسے اور چور اور زانی تک کے ساتھ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگ جائے۔ کیا اس قدر ذلیل اور رسوا ہو جانے کے بعد بھی "اسلام" اور "مسلمان" کی یہ دعوت باقی رہ سکتی ہے کہ ہر اس کے آگے عقیدت سے جھک جائیں اور آنکھیں اس کے لیے فرش راہ بنیں؟ جو شخص بازار بازار اور گلی گلی خوار ہو رہا ہو کیا کبھی اس کے لیے بھی آپ نے کسی کو ادب سے کھڑے ہوتے دیکھا ہے؟

یہ تو بہت ذلیل طبقہ کی مثال تھی۔ اس سے اذینچے تعلیم یافتہ طبقہ کی حالت اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ یہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام ایک نسلی قومیت کا نام ہے اور جو شخص مسلمان ماں باپ کے ماں پیدا ہوا ہے وہ بہر حال مسلمان ہے خواہ وہ عقیدہ و مسلک اور طرز زندگی کے اعتبار سے اسلام کے ساتھ کوئی دور کی مناسبت بھی نہ رکھتا ہو۔ سوسائٹی میں آپ چلیں پھریں تو آپ کو ہر جگہ عجیب و غریب قسم کے "مسلمانوں" سے سابقہ پیش آئے گا۔ کہیں کوئی صاحب ثنائیہ خدا اور رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اسلام پر پھبتیاں کس رہے ہیں، مگر میں پھر بھی



"مسلمان" ہی۔ ایک دوسرے صاحبِ خدا اور رسالت اور آخرت کے قطعی منکر ہیں اور کسی مادہ پرستانہ مسلک پر پورا ایمان رکھتے ہیں مگر ان کے مسلمان ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک تیسرے صاحبِ سود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں لیتے، مگر یہ یہ بھی "مسلمان"۔ ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم صاحبہ یا شریعتی جی بنائے ہوئے سینما لے جا رہے ہیں، یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحبِ زاوی سے وایولین بجا رہے ہیں، مگر آپ کے ساتھ بھی لفظ "مسلمان" بدستور چپکا ہوا ہے۔ ایک دوسرے ذاتِ شریف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تمام فرائض سے مستثنیٰ ہیں، شراب، زنا، رشوت، جوا اور ایسی سب چیزیں ان کے لیے جائز ہو چکی ہیں، حلال اور حرام کی تمیز سے نہ صرف خالی الذہن ہیں بلکہ اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں بھی ان کو یہ معلوم کرنے کی پروا نہیں ہوتی کہ خدا کا قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے، خیالات، اقوال اور اعمال میں ان کے اور ایک کافر و مشرک کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا، مگر ان کا شمار بھی مسلمانوں ہی میں ہوتا ہے۔ غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا "مسلمان" نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوئے، گدھ، بیڑ، تیترا اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام سے انحراف کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کا نظریہ اب یہ ہو گیا ہے کہ "مسلمان" جو کچھ بھی کرے وہ "اسلامی" ہے، حتیٰ کہ اگر وہ اسلام سے بغاوت بھی کرے تو وہ اسلامی بغاوت ہے۔ یہ بینک کھولیں تو اس کا نام "اسلامی بینک" ہو گا۔ یہ انشورنس کمپنی قائم کریں تو وہ "اسلامی انشورنس کمپنی" ہوگی۔ یہ جاہلیت کی تعلیم کا ادارہ کھولیں تو وہ "اسلم یونیورسٹی"، "اسلامیہ کالج" یا "اسلامیہ سکول" ہو گا۔ ان کی کافرانہ ریاست کو "اسلامی ریاست" کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ ان کے فرعون اور نمرود "اسلامی بادشاہ" کے نام سے یاد کیے جائیں گے۔ ان کی جاہلی زندگی "اسلامی تہذیب و تمدن" قرار دی جائے گی۔ ان کی موسیقی، مصوری اور بت تراشی کو "اسلامی آرٹ" کے معزز لقب سے ملقب کیا جائے گا۔ ان کے زندگی اور زوہام لاطائل کو "اسلامی فلسفہ" کہا جائے گا حتیٰ کہ



سوشلسٹ بھی ہو جائیں گے تو مسلم سوشلسٹ کے نام سے پکارے جائیں گے۔ ان سارے ناموں سے آپ آشنا ہو چکے ہیں، اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ "اسلامی شریعت" نے "اسلامی قحبہ خانے" اور "اسلامی قمار خانے" جیسی اصطلاح بھی آپ کا تعارف شروع ہو جائے۔ مسلمانوں کے اس شرع عمل نے اسلام کے لفظ کو اتنا بے معنی کر دیا ہے کہ ایک کا فرانہ چیز کو "اسلامی کفر" یا "اسلامی عنصیت" کے نام سے موسوم کرنے میں اب کسی کو تناقض فی الاز اصطلاح (Contradiction in terms) کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر کسی دکان پر آپ "بھری خوروں کی دکان گوشت" یا "ولایتی سودیشی بھنڈار" کا بورڈ لگا دیکھیں یا کسی عمارت کا نام "موصدین کا بتوانہ" سین تو شاید آپ سے منہسی ضبط نہ ہو سکے گی۔

جب افراد کی ذہنیات کا یہ حال ہے تو قومی مقاصد اور قومی پالیسی کا اس تناقض سے متاثر نہ ہونا ناممکن ہے۔ آج مسلمانوں کے اخباروں اور رسالوں میں، مسلمانوں کے جلسوں اور انجمنوں میں، مسلمان پڑھے لکھے طبقہ میں آپ ہر طرف کس چیز کی پکار سنتے ہیں؟ بس یہی ناکہ سرکاری ملازمتوں میں ہمیں جگہیں ملیں، غیر الہی نظام حکومت کو چلانے کے لیے جس قدر پُرزے درکار ہیں ان میں سے کم از کم اتنے پُرزے ہم پر مشتمل ہوں۔ شریعت ساز مجلسوں (Legislatures) نشستوں میں کم از کم اتنا تناسب ہمارا ہو۔ مَن دُوْ حُجُکُم بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِن کَم سے کم اتنے فی صدی ہم بھی ہوں۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَقَاتِلُوْنَ فِی سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ میں غالب حصہ ہمارا ہی رہے۔ اسی کی ساری پیچ پکار ہے۔ اسی کا نام اسلامی مفاد ہے۔ اسی محور پر مسلمانوں کی قومی سیاست گھوم رہی ہے۔ یہی گروہ عملاً اس وقت مسلم قوم کی پالیسی کو کنٹرول کر رہا ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کو زندہ یہ کہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اس کی عین ضد ہیں، غور کا مقام ہے کہ اگر اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ ہوتا تو کیا اس کا نقطہ نظر یہی ہوتا؟ کیا کوئی اجتماعی اصلاح کی تحریک اور کوئی ایسی جماعت جو خود اپنے اصول پر دنیا میں حکومت قائم کرنے کا داعیہ رکھتی ہو، کسی دوسرے اصول کی حکومت میں اپنے پیروں کو کل پُرزے بننے کی اجازت دیتی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ اشتراکیوں نے بینک آف انگلینڈ کے نظام میں



اشتراکی مفاد کی حفاظت کا سوال اٹھایا ہو یا فاشسٹ گرائڈ کونسل میں اپنی نمائندگی کے مسئلہ پر اشتراکیت کے بقار و فنا کا انحصار رکھا ہو؟ اگر آج روسی کمیونسٹ پارٹی کا کوئی ممبر نازی حکومت کا وفادار خادم بن جائے تو کیا آپ توقع کرتے ہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اسے پارٹی میں رہنے دیا جائے گا؟ اور اگر کہیں وہ نازی آرمی میں داخل ہو کر نازیٹ کو سر بلند کرنے کی کوشش کرے تو کیا آپ اس کی جان کی سلامتی کی بھی امید کر سکتے ہیں؟ مگر یہاں آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ اسلام جس روٹی کو زبان پر رکھنے کی اجازت بھی شاید انتہائی اندیشہ نگرانی حالت میں دیتا، اور جس کو حلق سے اتارنے کے لیے غیور باغی و کاعاد کی شرط لگاتا، اور پھر تاکید کرتا کہ جس طرح سخت جھوک کی حالت میں جان بچانے کے لیے سو رکھنا یا جا سکتا ہے اسی طرح بس یہ روٹی بھی بقدرِ مسدود متقی کھالو۔ یہاں اس روٹی کو نہ صرف غنیمت قرار دینا کر کے پورے انبساط کے ساتھ کھایا جاتا ہے، بلکہ سن پر کفر اور اسلام کے معرکے سر ہوتے ہیں، اور اسی کو اسلامی مفاد کا مرکز ہی نقطہ قرار دیا جاتا ہے! اس کے بعد تعجب کیجیے اگر ایک اخلاقی و اجتماعی مسک کی حیثیت سے اسلام کے دشوے، حکمرانی کو سن کر دنیاہاق اڑانے لگے۔ کیونکہ اسلام کی نمائندگی کرنے والوں نے خود اس کے وقار کو اور اس کے دشوے کو اپنے معبود شکم کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

اور دیکھیے۔ آپ کے ہاں اب سانس بڑے طنطنہ کے ساتھ ایسا فوجی تحریک سے کرا اٹھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ تمھاری شوکتِ رفتہ کو پھر تازہ کردوں گا اور تمھیں زمین میں غلبہ دلوں اور چیلروں کا۔ آپ کے ہر روز نہیں لاکھوں آدمی ان کی طرف دھڑکتے ہیں۔ رکھوں ان سے فداج وہ مانی کی آس رہتے ہیں۔ اب کلمہ نہیں ادھر سے ادھر تک ان کی حرکت کرتا ہے اور دیکھتے دیکھتے یہ سب سلام کے سپہ سالار اور مدد کے امیر ملحق بن جاتے ہیں۔ مگر آپ میں سے بہت کم لوگوں کو یہ خیال آتا ہے کہ ان خاندان کے فہم قرآن، ان کے اخلاق، ان کی رفتار، ان کے اعمال، دوران کے طریق کار کا بھی جائزہ لے لے دیکھیں۔ ابک شخص آدمی اصطلاحات کے پردے میں میکیا ویلی، ڈارون، ارنسٹ ہیکل اور کالان بیرون جیسے لوگوں کے نظریات پیش کرتا ہے، لیکن سچی



اور قانون شرعی کو خلط ملط کر کے اسلام کی جڑ بنیاد تک اٹھاڑ پھینکتا ہے، ایمان، اسلام، تقویٰ، عبادت، توحید، رسالت، جہاد، ہجرت، اطاعت امر، جماعت، سب کے مفہوم بدل کر رکھ دیتا ہے اور تم زہر کے یہ سارے گھنٹھ محض اس لالچ میں حلق سے نیچے اتار جاتے ہو کہ یہ مسلم قوم کی عسکری تنظیم تو کمر ہی دے گا۔ ایک شخص عداوت جھوٹ بولتا ہے، جھوٹ پر اپنی تحریک کی پوری مہارت کھڑی کرتا ہے، غیر مسلموں تک کے سامنے اپنے کذب و دروغ سے اسلام اور مسلمانوں کو رسوا کرتا ہے، اپنی بدزبانی اور لاف زنی سے مسلمانوں کے قومی اخلاق کی خوب تخریب و تضحیک کرتا ہے، غیر مسلموں کے مقابلہ پر آگے پہلی ضرب کھاتے ہی معافی مانگتا ہے، پھر اپنے وقار کو بچانے کے لیے علی الاعلان جھوٹ بولتا ہے کہ میں نے معافی نہیں مانگی، اور پھر لاف زنی کرتا ہوا وہیں لڑنے پہنچ جاتا ہے جہاں اس نے واپس نہ جانے کا عہد کیا تھا۔ تم یہ سب کچھ دیکھتے ہو اور اس کے باوجود اس کے پیچھے لگے رہتے ہو محض اس امید پر کہ یہ ہمیں دنیوی کامیابیوں سے ہمکنار تو کر دے گا۔ ایک شخص کی تحریر و تقریر اور ایک ایک حرکت سے دناؤت، سفلہ پن، اور بازاریت ٹپکی پٹکی ہے۔ تقویٰ، صداقت اور وقار کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا اور تم اس کی امارت تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ حد یہ ہے کہ وہ پچاس ہزار مسلمانوں کی جانیں غیر الہی حکومت کے لیے برباد کر دیتا ہے اور اس خدمت گزاری کا فائدہ تمہیں یہ بتاتا ہے کہ اس یہاں تم کو عسکری ٹریننگ مل جائے گی اور تمہاری فوجی پوزیشن مضبوط ہو جائے گی۔ تم اس ذلیل تدبیر کی خوراک بھی حلق سے اُتار لیتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ ہمیں ایک فوجی تنظیم کرنے والا امیر تو مل گیا۔ یہ سب باتیں بتا رہی ہیں کہ تمہارا معیار اخلاق و انسانیت کس قدر گر گیا ہے۔ تم جس اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہو وہ دنیا میں یہ اصول قائم کرنے آیا تھا کہ انسان کا مقصد ہی صرف پاک ہونا چاہیے بلکہ اس کو حاصل کرنے کے ذرائع بھی پاک ہونے چاہئیں۔ مگر تمہارا حال یہ ہے کہ جس ذریعہ سے بھی تم کو کامیابی کے حصول کی امید نظر آتی ہے، خواہ وہ کتنا ہی ناپاک اور ذلیل ذریعہ کیوں نہ ہو، تم دڑ کر اُسے دانتوں سے پکڑ لیتے ہو اور جو تمہیں اس سے روکنا چاہے اُس اُسی کو پھاڑ کھانے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ ذرائع کی پاکی و ناپاکی سے قطع نظر کر کے محض کامیابی کو مقصود بالذات بنانا تو دہریوں اور کافروں کا شیوہ ہے۔ اگر مسلمان نے بھی یہی کام کیا



تو اس کی خصوصیت کیا باقی رہی؟ بلکہ یہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد دوسری جاہل قوموں سے الگ، مسلمان کے جداگانہ وجود کے لیے کرنسی وجہ جواز رہ جاتی ہے؟

اور اوپر چلیے۔ آپ کی سب سے بڑی قومی مجلس، مسلم لیگ، جس کو نو کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے، ذرا اس کو دیکھیے کہ اس وقت وہ کس روش پر چل رہی ہے۔ موجودہ جنگ کے آغاز میں اس نے اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا اور پھر وائسرائے کے اعلان پر جس رائے کا اظہار کیا، اس کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ اگر آپ ایک اصول پرست جماعت کے طرز عمل، اور ایک ایسی جماعت کے طرز عمل میں جو محض اپنی قوم کی سیاسی اغراض کی خدمت کے لیے بنی ہو، فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو اول نظر میں آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ جنگ کے موقع پر جو پالیسی لیگ نے اختیار کی ہے وہ اصول پرستی کے ہر نشان سے خالی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت یہی پالیسی مسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے، تو اس کے آئینے میں ہر صاحب نظر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ان نام نہاد مسلمانوں پر پوری طرح اخلاقی موت وارد ہو چکی ہے۔ مقامی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی جو سیاسی پوزیشن اس وقت ہے، اس پوزیشن میں اگر دنیا کی کوئی اور قوم ہوتی تو اس کی لیگ بھی ایسی ہی پالیسی اختیار کرتی، اور قریب قریب انہی الفاظ میں اپنا ریزولیشن مرتب کرتی۔ آپ مسلم کے بجائے سکھ، پارسی، جرمن، اٹالین، جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہی سیاسی موقف اور یہی مقامی حالات اس کے ساتھ وابستہ کر دیئے، اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ آپ اس ریزولیشن کو ان میں سے ہر قوم کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان اب اسی سطح تک گر گیا ہے جس سطح پر دنیا کی تمام قومیں ہیں۔ ایک موقع و محل پر دنیا کی کوئی کافر و مشرک قوم جو طرز عمل اختیار کر سکتی ہے وہی مسلمان بھی اختیار کر رہا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ میں اولاً اور بالذات ایک اخلاقی اصول کا نمائندہ اور وکیل ہوں، اسی حیثیت سے میرا نام مسلمان ہے، میرا کام سب سے پہلے ایک معاملہ کے اخلاقی پہلو کو دیکھنا ہے، اور میری مسلمان ہونے کی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسی پہلو پر اپنے فیصلہ کا مدار رکھوں۔ اگر میں نے بھی صرف یہی دیکھا کہ بیش آمدہ معاملہ خود مجھ پر اور میری قوم پر کیا اثر ڈالتا ہے، اور یہ کہ میں



اس صورت حال میں اپنے لیے کس طرح فائدہ حاصل کر سکتا ہوں، تو پھر مسلمان کے نام سے میرے الگ وجود کی کوئی وجہ باقی ہی نہیں رہتی۔ ایسا طرز عمل تو اگر میں نہ مسلمان ہوتا اور کسی آسمانی کتاب کی مجھے ہوا بھی نہ لگی ہوتی تب بھی میں اختیار کر سکتا تھا۔

یہ اس معاملہ کو ہندوستانی وطن پرست کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا۔ مجھے اس سے بھی کوئی بحث نہیں کہ یہ سیاسی حیثیت مسلم لیگ کی یہ پالیسی مسلمان نام کی اس قوم کے لیے، جو ہندوستان میں لستی ہے، مفید ہوگی یا مضر۔ میرے بنے جو سوال اہمیت رکھتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو قوم اس وقت مسلمان کے نام سے پکارے جانے کے باعث دنیا میں اسلام کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے، اس کی سب سے بڑی مجلس نے دنیا کے سامنے اسلام کو کس رنگ میں پیش کیا ہے؟ اس نقطہ نظر سے جب میں مسلم لیگ کے ریزولوشن کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے۔ ان لوگوں کو ایک موقع اور نادار موقع ملا تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا کی ساری قوموں پر اپنے اخلاقی مرتبہ، برتری کا سکہ جمادیتے۔ ان کو ایک بیش قیمت موقع ملا تھا اس حقیقت کے اظہار کا کہ ہم ایک اخلاقی اصول کے پیروکار ہیں، اور وہ اخلاقی اصول حق اور عدل کی پاک ترین روح کا حامل ہے، اور دنیا میں صرف ہماری جماعت ہی وہ ایک جماعت ہے جو شخصی یا قومی نفع و نقصان کے تصورات سے بالاتر ہو کر مجرد اخلاق کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ اگر لیگ کے رہنماؤں میں اسلامی حس کا شائبہ بھی موجود ہوتا تو وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ دیتے۔ اور اس کا جو گہرا اخلاقی اثر مرتب ہوتا، اس کی قدر و قیمت کے مقابلہ میں کوئی نقصان جو ایسا طرز عمل اختیار کرنے کی وجہ سے حاصل ہونے کی توقع ہے، قطعاً کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مگر افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملہ کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہیں جیسی دنیا میں دوسری اور قومیں ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن یہی چال اور ہر مفید مطلب سیاسی تدبیر سے اس قوم کے مفاد کی حفاظت کر دینا ہی بس "اسلامی سیاست" ہے۔



حالانکہ ایسی ادنیٰ درجہ کی سیاست کو اسلامی سیاست کہنا اسلام کے لیے ازالہ حیثیت عربی سے کم نہیں !  
 ”مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف پہلوؤں سے یہ چند مثالیں جو میں نے پیش کی ہیں۔ یہ سب  
 ایک ہی نتیجہ کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اس وقت تنزل و انحطاط کے اس آخری  
 مرحلے پر پہنچ گئی ہے جہاں ایک تحریک کی روح ناپید ہو جاتی ہے، صرف اس کا نام باقی رہ جاتا ہے، اور اس نام کا  
 اطلاق، برعکس ہند نام زنگی کا فور کے بمصداق، اُن چیزوں پر ہونے لگتا ہے جو اس کے اصل معنی کی ضد ہوتی  
 ہیں۔ نظریات غیر اسلامی اور نام اُن کا مسلمان۔ مقاصد غیر اسلامی اور اُن کا نام بھی مسلمان۔ سیرت غیر اسلامی  
 اور اس پر بھی لفظ مسلمان چسپاں۔ رویہ غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان کو بے تکلف اطلاق۔ افراد سے  
 لے کر جماعتوں تک، سوسائٹی کے ادنیٰ ترین طبقوں سے لے کر بلند ترین طبقوں تک، چھوٹی انجمنوں سے لے کر  
 بڑی سے بڑی مجلسوں تک، ہر طرف اسی ایک وبائے عام کے اثرات پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے دل  
 نے بار بار یہ سوال کیا ہے کہ اسلام جو کبھی آندھی اور طوفان کی طرح اٹھ اٹھتا تھا، جس کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت  
 نہ ٹھہر سکتی تھی، آج اس کی کشور کشائی اور عالمگیری آخر کس چیز نے چھین لی؟ اس کا جواب ہر بار مجھے یہی ملتا رہا  
 تحریک پر تنزل و انحطاط کے اسی قانون کا عمل جاری ہوا ہے جب میں ابتداء میں بیان کر آیا ہوں۔ اب اصلاح  
 کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کو از نیر نو ایک تحریک کی حیثیت سے اٹھایا جائے اور مسلم کے معنی کو پھر  
 سے تازہ کیا جائے۔ فردوں کی اس بستی میں جو تھوڑے بہت مسلمان دل بھی حرکت کرتے ہیں۔ اور جن کی آواز  
 سے ابھی تک یہ شہادت بند ہو رہی ہے کہ اسلام ہی حق اور صداقت ہے اور الٰہی ہدایت کی فلاح صرف طریق  
 اسلامی ہی میں ہے، اُن لوگوں کو اپنا پاسیہ کہ اب کرنے کا کام ہے۔ — مگر اس کام کو کون کھیل نہیں سکتا۔  
 یہ وہ کون ہے جس کے تصور ہی سے فریاد و رنج و آہ ہو جاتا ہے۔



# نسلی مسلمانوں کے لیے دور ہیں

عمل، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، بہر حال اس کی صحت کے لیے دو چیزیں شرط لازم ہیں:

پہلی شرط خود شناسی ہے۔ آپ کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ آپ کیا ہیں، اور جو کچھ آپ ہیں اس ہونے کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر اگر اس تحقیق سے آپ پر کوئی ایسی حقیقت منکشف ہو جس سے آپ راضی نہ ہوں، یعنی آپ کی خواہش یہ ہو کہ جو کچھ آپ ہیں وہ نہ رہیں بلکہ کچھ اور ہو جائیں، تب بھی آپ کے لیے لازم ہے کہ اُس کچھ اور کا تعین کریں اور جو کچھ بھی آپ ہونا چاہتے ہیں اس کے مقتضیات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

دوسری شرط قوت فیصلہ اور قوت ارادی ہے۔ آپ کو بہر حال یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ جو کچھ آپ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، یا کچھ اور بننے کے خواہشمند ہیں۔ پھر اس فیصلہ کی رو سے جو کچھ بھی آپ ہونا چاہیں، اُس ہونے کے مقتضیات کا بار اٹھانے کے لیے آپ کو تیار رہنا چاہیے۔ اس سے بڑھ کر خطرناک بات کسی شخص یا گروہ کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک پوزیشن سے محبت اور دوسری پوزیشن کا لالچ رکھتا ہو، کبھی اس پوزیشن سے حمیت جائے اور کبھی اُس پوزیشن کی طرف پیکے۔ مگر دونوں میں سے کسی ایک کے مقتضیات بھی پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس تلون اور تردد کا لازمی نتیجہ خام کاری ہے۔ جو شخص یا گروہ اس حالت میں مبتلا ہو وہ بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی ثبات اور قرار نہیں ہوتا۔ اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پتہ جو زمین پر پڑا ہو اور ہواؤں کے جھونکے اُسے اُڑائے اُڑائے لیے پھریں۔

مسلمانوں کے افراد اور ان کی جماعتوں کے اعمال میں تلون اور خام کاری کی جو کیفیات ایک مدت سے نمایاں ہیں اور اب نمایاں تر ہو گئی ہیں ان کے اسباب پر میں نے جتنا زیادہ غور کیا اتنا ہی زیادہ مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ تمام خرابیوں کی جڑ انہی دو چیزوں کا فقدان ہے۔ کہیں خود شناسی مفقود ہے اور کہیں قوت فیصلہ



دقوت ارادی۔

ایک معتد بہ جماعت ہم میں ایسی ہے جو سرے سے اپنی خودی کا احساس ہی نہیں رکھتی۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں اور اس کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر بھلا اس سے یہ امید کیسے کی جاسکتی ہے کہ اپنے انفرادی یا اجتماعی عمل کے لیے وہ کوئی ایسا راستہ منتخب کرے گی جو مسلمان کو کرنا چاہیے؟

ایک دوسری جماعت اوم وہ بھی معتد بہ، ایسی ہے جو شعور ذات تو رکھتی ہے مگر قوت فیصلہ اور قوت ارادی نہیں رکھتی۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں، اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ جو کچھ ہم ہیں اس ہونے کے مقتضیات کیا ہیں، لیکن اس علم نے ان میں محبت اور خوف کے دو گونہ جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ جو کچھ یہ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں کیونکہ انھیں اپنی حیثیت سے محبت ہے، لیکن جو کچھ یہ ہیں اس ہونے کے مقتضیات کی ذہنت ان پر طاری ہو گئی ہے یہ جانتے ہیں کہ مسلمان ہونا کھیل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ذمہ داریوں کا ایک بھاری بوجھ آتا ہے۔ اس کے ساتھ پابندیاں ہیں۔ ایثار اور قربانی ہے۔ جہاد اور مشقت ہے۔ ایک ایسا سخت مشن ہے جس میں دنیا بھر سے لڑائی ہو اور اس لڑائی کے معاوضہ میں خدا کی خوشنودی کے سوا کسی چیز کی طلب بھی جائز نہیں۔ اس ہولناک چیز کا خوف ان کے دلوں پر ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ یہ مسلمان ہونے کے مقتضیات سے کتر کر بھاگتے ہیں، اور کوئی ایسی پوزیشن اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں آسانی ہو۔ مگر انھیں خود بھی معلوم ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت باقی رکھ کر یہ کوئی دوسری حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کی قوت فیصلہ جواب دے گئی ہے یہ اسلام اور کفر کے درمیان متردد ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسلام سے چپٹنا چاہتے ہیں مگر اس کے مقتضیات کا خوف کچھ کر دور بھاگتے ہیں۔ کفر کی آسائشوں اور نذلوں اور فائدوں کو دیکھ کر اس کی طرف پلکتے ہیں، مگر وہ کہتا ہے کہ میری طرف آتے ہو تو پورے کافروں کو آؤ اور میرے مقتضیات پورے کر دو یہ اس کے لیے بھی تیار نہیں۔ لہذا اس سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ اب ان کی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہو کر رہ گئی ہے جو ہر طرف آسائشیں اور فائدے ڈھونڈتا ہو، مگر کسی طرف کی بھی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔



مسلمانوں کی جماعت زیادہ تر انہی دو گروہوں پر مشتمل ہے، اس لیے عموماً جو اجتماعی تحریکیں مسلمانوں میں پھیل رہی ہیں وہ اسلامی نقطہ نظر سے غلط ہیں۔ ان کے مقاصد میں غلطی ہے۔ ان کے طریق کار میں غلطی ہے۔ ان کی قیادت میں غلطی ہے، اور ان کی روحی کیفیت میں غلطی ہے۔ بہت سے لوگوں کو توجہ شعوری کی وجہ سے اس غلطی کا احساس ہی نہیں ہوتا اس لیے وہ جوش و خروش کے ساتھ ان تحریکوں کو چلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی تحریک کے درست ہونے کے لیے بس یہی بات کافی ہے کہ اس میں "مسلمان" کا فائدہ ہے۔ *يَحْسِبُونَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا* اور بہت سے لوگ جن کو غلطی کا احساس ہے وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی کمزوری کے باعث ان تحریکوں کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ ان کے نفس انھیں یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان ایک بین بین راہ چلنے ہی میں سلامتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان کوئی بیچ کی راہ نہیں ہے اور ایسی کسی راہ پر چل کر مسلمان کہیں کے بھی نہیں رہتے۔ لہذا مسلمانوں کی حقیقی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے سامنے واضح طور پر اسلام اور جاہلیت کی راہوں کو ان کے مقتضیات اور ان کے نتائج کے ساتھ کھول کر پیش کر دیا جائے، اور انھیں مشورہ دیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں۔

میں نے ترجمان القرآن میں "قوم" اور "جماعت" کے اصولی فرق کی بحث اسی توضیح کے لیے چھیڑی تھی۔ اس بحث میں میں نے قرآن اور حدیث کی شہادت سے یہ ثابت کیا تھا کہ "مسلمان" کی اصطلاح جس گروہ کے لیے وضع کی گئی ہے، وہ دراصل ایک "قوم" نہیں ہے بلکہ ایک "جماعت" ہے۔ اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "قوم" ہونے اور "جماعت" ہونے کے مقتضیات و نتائج میں کیا فرق ہے۔ مجھے اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں کہ آپ کو قوم کے بجائے جماعت بننے پر مجبور کرے۔ آپ کو پورا اختیار ہے کہ جو چاہیں نہیں۔ البتہ جو خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کے ذہن کی الجھن اور نظر کے دھند کو دور کر دیں، تاکہ آپ دونوں حیثیتوں کا صحیح موازنہ کر لیں اور آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ ان حیثیتوں کے جمع کرنے کی جو صورتیں آپ نکال رہے ہیں یہ اصولاً غلط اور



نتائج کے اعتبار سے ہلک ہیں۔

ایک گروہ میں قومیت کا احساس دراصل تاریخی اثرات اور تہذیبی وراثت کے تسلسل سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جب کچھ لوگ ایک طویل مدت تک ایک قسم کے اخلاقی تصورات اور ایک قسم کے معاشرتی طور طریقوں کے ساتھ باہم متفق اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل اس ورثہ کو لے کر اپنے اندر مستحکم کرتی چلی جاتی ہے، تو ان میں اپنے مستقل اجتماعی وجود کا وہ احساس پیدا ہو جاتا ہے جسے قومیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چند عادات میں اور رسمیں ہوتی ہیں جن سے زمانوس ہوتے ہیں۔ چند تخیلات ہوتے ہیں جن سے انھیں محبت ہوتی ہے اور جن کی ترجمانی ان کا طریقہ چر کیا کرتا ہے۔ انہی چیزوں کے مجموعہ کو ان کی کلچر کہا جاتا ہے۔ ان میں طبعاً یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کلچر یعنی اسلاف کے اس ورثہ کو باقی رکھیں اور اپنے اخلاف کے لیے چھوڑ جائیں تاکہ ان کی قومی زندگی کا تسلسل قائم رہے۔

اس معنی میں جو گروہ ایک قوم بن گیا ہو اس میں قومیت کا شعور پیدا ہونے کے بعد طبعی طور پر یہ خواہش ابھر آتی ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کا ضبط اس کے اپنے ہاتھ میں ہو اور کسی دوسرے گروہ کی مرضی اس پر مسلط نہ ہونے پائے۔ یہ اس گروہ کا سیاسی مفاد ہے۔

اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہمیشہ کے جو دراصل اس کے پاس ہیں ان کی حفاظت کرے، اور جو مزید حاصل ہو سکتے ہوں انھیں حاصل کرے تاکہ اس کے افراد زیادہ سے زیادہ خوش حال ہوں۔ یہی چیز ہے جس کو معاشی مفاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ قومیت کا یہ مفہوم جو اوپر بیان ہوا ہے، اس لحاظ سے ہندوستان کے مسلمان صدیوں کے تواریخ کی بدولت ایک قوم بن چکے ہیں، اور اب دوسرے تمام گروہوں سے ممتاز وہ اپنا ایک مستقل اجتماعی وجود رکھتے ہیں۔ اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ دوسرے گروہوں کی ایک اکثر تعداد کے درمیان گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے ان کے یہی اور معاشی مفاد، اور ان کی کلچر کے تحفظ کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔



جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مگر سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت بس یہی ہے؟ کیا وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی بہت سی قوموں میں سے ایک قوم ہیں؟ کیا ان کی قومیت کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ ایک گروہ نے نسل بعد نسل ایک طرح کی زندگی بسر کر کے اپنے اندر قومیت پیدا کر لی ہے؟ کیا وہ کلچر جسے یہ اسلامی کلچر کہتے ہیں، محض موروثی عادات و رسوم اور تاریخی تجارت کا مجموعہ ہے؟ کیا ان کے اصل قومی مسائل صرف یہی ہیں کہ جس ورثہ کو انھوں نے باپ دادا سے پایا ہے اس کی حفاظت کریں، جن وسائل معیشت اور جن سیاسی اقتدارات پر وہ ابھی تک قابض ہیں انھیں ہاتھ سے نہ جانے دیں، جن چیزوں کی انھیں اپنے گروہ کے افراد کی خوش حالی کے لیے ضرورت ہے، ان کو حاصل کر لیں، اور فی الحبلہ ان کی اجتماعی زندگی کا ضبط ان کے اپنے ہی ہاتھ میں رہے؟

اگر یہی مسلمانوں کی قومیت اور یہی ان کی کلچر ہے، اور یہی ان کے قومی مسائل ہیں تو بلاشبہ وہ سب قومی تحریکات درست ہیں جو اس وقت ان میں چل رہی ہیں۔ اس صورت میں:

ان کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ ان کی ایک لیگ ہو جس میں وہ سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور مسلمانوں کے نظام معاشرت سے وابستہ ہیں۔ انہی کے گروہ کے کچھ لوگ ان کے قائد ہوں جن کے اشاروں پر یہ حرکت کریں۔ اور ان کی تمام جدوجہد کا مقصد صرف یہ ہو کہ جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے وہ جانے نہ پائے، اور جو کچھ فرید ہاتھ آسکتا ہو وہ آجائے، قطع نظر اس سے کہ اسلام، جس کے نام پر یہ اپنی قوم کو مسلمان کہتے ہیں، اس کو جائز سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔ ان کے لیے نامتراہمیت صرف اسی ایک چیز کی ہونی چاہیے کہ ملک کا نظم و نسق خواہ کسی نوعیت کا ہو، بہر حال اس کے ضابطہ میں خود ان کے اپنے افراد کو کافی حصہ ملے تاکہ اپنے آبائی ورثہ (یعنی اپنی کلچر) کو وہ خود جس صورت میں بھی باقی رکھنا چاہیں، رکھ سکیں، اور جس قسم کے بھی فوائد و منافع ملک کی آبادی میں تقسیم ہو رہے ہوں ان میں سے ایک معتد بہ حصہ ان کے افراد کو بھی مل جائے۔



ان کے لیے یہ بھی درست ہے کہ موقع اور محل کو دیکھ کر یہ ملک کی جس پارٹی کے ساتھ جن شرائط پر چاہیں معاملہ کر لیں، بشرطیکہ اس معاملہ میں ان کے اپنے گروہ کا فائدہ منظور ہو۔ ایسے کسی معاملہ میں قومی غداری کا سوال صرف اس وقت پیدا ہوگا جب معاملہ جان بوجھ کر نقصان کے ساتھ کیا جائے، یا اس میں اپنی قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ان کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ جس طرح دوسری قوموں میں قوم پرستی (نیشنلزم) پیدا ہوئی ہے اسی طرح ان میں بھی ہو۔ یہ بھی اٹلی اور جرمنی اور جاپان کی طرح غلبہ اور ممکن فی الارض کا مطالبہ کریں۔ ان کی تنظیم بھی فاشستی اصولوں پر کی جائے۔ یہ بھی انتخاب طبعی اور بقائے اصلح کے قانون کے مطابق اپنے آپ کو بھیڑیے کی طرح "صالح" ثابت کریں اور غیر صالح بکریوں کو ہضم کرنا شروع کر دیں۔ یہ بھی امپیریلسٹ قوموں کے زمرے میں شامل ہو جائیں جس طرح ممکن ہو زمین میں غلبہ حاصل کریں، اور اسی دنیا کی زندگی میں اسی زمین پر اپنے لیے جنت تجرئی من تحتھا الاکثر کا لطف پیدا کر لیں۔

قومیت کا یہ نظریہ اختیار کر لینے کے بعد آپ کے لیے یہ سب کچھ درست ہو جاتا ہے، مگر خوب جان رکھیے کہ اسلام کو اس قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام کو نہ تو کسی نسل گروہ سے دلچسپی ہے۔ نہ وہ کسی جماعت کی موروثی عادات اور رسوم سے لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ وہ دنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا مجموعہ اشخاص کی منفعت کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ان کے اندر اپنے نام سے ایک اور گروہ کا اضافہ کر دے۔ نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالمقابل تنازع للبغائر کے میدان میں اُتریں اور انتخاب طبعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے۔ لہذا اگر یہ آپ کی قومیت اور یہ آپ کی کلچر ہے، اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں، تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمالیں، اسلام کا نام استعمال کرنے کا

سہ خواہ وہ کانگریس پارٹی ہو یا سوشلسٹ پارٹی یا کوئی اور۔



آپ کو حق نہیں ہے، کیونکہ اسلام آپ کی اس قومیت اور اس پلچر سے تبری کرتا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ اسلام ہی کا نام استعمال کرنے پر آپ کو اصرار کیوں ہو؟ "مسلمان" کے معنی و مفہوم سے تو آپ کو کوئی بحث ہے ہی نہیں۔ آپ کو تو اپنی قومیت کے لیے بس ایک نام چاہیے۔ سو اس غرض کے لیے آپ جو نام بھی وضع کر لیں گے وہ آپ کی مستقل اجتماعی حیثیت پر اُسی طرح دلالت کرنے لگے گا جس طرح اب لفظ "مسلمان" کر رہا ہے۔ آخر اس نوع کی قومیت میں کوئی خصوصیت ہے جس کے لیے لفظ "مسلمان" ہی استعمال کرنا ضروری ہو۔

اس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اسی لیے نہیں کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھ رہے ہیں، اصولاً اسلام کے خلاف ہیں۔ بلکہ اس کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کے بے رسوائی و بدنامی کا موجب ہوگا۔ دینا آپ کی حرکات کو دیکھ کر سمجھے گی کہ اسلام ہی کچھ سکھاتا ہوگا، اور یہ چیز اس کو اسلام سے اور زیادہ دور پھینکے گی۔ آپ اپنے قومی مفاد کی حفاظت کے لیے غیر اسلامی فوج میں اپنا تناسب قائم رکھنے کی کوشش کریں گے، اور دینا یہ سمجھے گی کہ شاید یہ اسلام کی تعلیم ہے کہ جو تمہیں پندرہ روپے تنخواہ دے اس کے حکم سے تم ہر ایک کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ اپنے قومی مفاد کی خاطر ہر اس منفعت کو دانتوں سے پکڑنے کی کوشش کریں گے جو کسی مسلمان یا بہت سے مسلمانوں کو کسی طور سے حاصل ہو یا ہو سکتی ہو، اور دینا اس نانت کو اسلام کی طرف منسوب کرے گی۔ آپ انتہائی بے اصولی کے ساتھ کہیں ایک چیز کی حمایت کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے مطابق ہے، اور کہیں اُسی چیز کی مخالفت کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے خلاف ہے، کبھی ایک پارٹی سے ملیں گے اور کبھی اُسی پارٹی سے لڑیں گے، نہ اس لیے کہ آپ کے اور اس کے درمیان اصولی اتفاق یا اتحاد ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ آپ کے پیش نظر اصول نہیں قومی مفاد ہے۔ یہ ابن الوقتی جو آپ کے کیرکٹر سے ظاہر ہوگی، دینا سمجھے گی کہ ایسا ہی کیرکٹر اسلام پیدا کرتا ہے۔ آپ قومی مفاد کی تلاش میں ہر طرف



لیکیں گے، فاشنزم کے اصول یا کمیونزم کے نظریات بھی اختیار کریں گے، ظالمانہ سرمایہ داری اور مستبدانہ شخصی ریاستوں کے دامن میں بھی پناہ لیں گے، انگریز اور ہندو اور ریاستہائے ہند جس کے آستانہ پر بھی فائدہ کا بُت بیٹھا نظر آئے گا اسی کی طرف مجدد ریزہوں گے، اور یہ سارے داغ آپ کے توسط سے اسلام کے دامن پر لگتے چلے جائیں گے۔ اسلام نے صدیوں آپ پر جو احسانات کیے ہیں ان کا کم از کم یہ بدلہ تو نہ ہونا چاہیئے کہ آپ اس طرح اس کی رسوائی کا سامان کریں۔

لیکن اگر آپ کو اسلام سے واقعی محبت ہے اور حقیقت میں آپ مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ جان لینا چاہیئے کہ اسلام یہودیت اور ہندو ازم کی طرح ایک نسلی مذہب نہیں ہے جو ایک نسلی قومیت بنانا ہو۔ بلکہ وہ تمام نوریخ انسانی کے لیے ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک ہے۔ ایک جہانی نظریہ World Theory

اور ایک عالمی تصور Universal Idea ہے۔ وہ ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس مسلک میں نظریہ، اس تصور کو لے کر اُٹھے، اور دنیا کے سامنے اس کا نقشہ پیش کرے، اور جس جس قوم کے جو جو لوگ اس کو قبول کرتے جائیں انھیں اپنی جماعت میں شامل کرتی چلی داسے، یہاں تک کہ قوموں کے درمیان تفریق کی دیواریں مسمار ہو جائیں۔ اس کے نزدیک 'اسلامی' صرف وہ چیز ہے جو اس مسلک اور اس کے فرائض کے مطابق ہو، اور جو چیز اس کے خلاف ہو اس کو وہ اپنانے سے صاف انکار کرتا ہے خواہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ذاتی مفاد اس سے وابستہ ہو۔ لہذا اگر آپ اسلام کے مسلک کی خاطر جیسیں اور اس کو دینا پس حکمران بنانے کے لیے جدوجہد کریں تب تو یقیناً آپ اسلامی جماعت اور مسلمانانہ کردہ ہوں گے، مگر وہ اپنے لیے جتنے اور اپنے مفاد کے لیے جدوجہد کرنے کی صورت میں اسلام سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ آپ کو یہ گزریہ حق نہیں پہنچتا کہ کام اپنے لیے کریں اور نام اسلام کو لیں۔

مسلک اسلام کی اس جہانی و عالمی نوعیت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب یہ بھی سمجھ لیں چاہیئے کہ ایک عالمی مسلک اور جہانی نظریہ کے مقتضیات کیا ہوتے ہیں۔



اولاً وہ مختلف پارٹیوں میں سے ایک پارٹی بن کر رہنے پر قانع نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی فطرت کا اقتضائے یہ ہوتا ہے کہ بس وہی ایک ہو۔ وہ مقابل کی کسی طاقت کو اپنا شریک و سہیم بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مدارات اور مصالحت (Compromise) کرنا اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ وہ سودا نہیں کرتا بلکہ غائب ہونا چاہتا ہے، لِيُظْهِرَ عَلَى الدِّينِ كُفْلَهُ دَلُوكِ كَا الْمُسْرِ كُونُ۔

ثانیاً وہ اشخاص یا طبقوں یا قوموں کے نقطہ نظر سے مسائل کو نہیں دیکھتا بلکہ کلی اور جہانی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے اس امر سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہوتی کہ اس شخص یا اس طبقہ یا اس گروہ کا فائدہ کس چیز میں ہے۔ اس کو انسان سے بحث ہوتی ہے، اور وہ ان مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے جو مجموعی حیثیت سے انسان کے لیے حل طلب ہوں قطع نظر اس سے کہ کس کو کیا ملتا ہے اور کس سے کیا چھنتا ہے، كُنْتُ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔

ثالثاً اس کے پیش نظر وقتی یا مقامی مقاصد نہیں ہوتے بلکہ ایک دائمی اور جہانی مقصد ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں زندگی کا جو نظام اس کے اصول کے خلاف قائم ہے اس کو توڑ ڈالے اور اپنے اصول کے مطابق مستقل طور پر ایک نظام قائم کرے۔

رابعاً وہ ایسی قومیت کے تنگ دائرے میں بند ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو نسلی اور تاریخی روایات پر قائم ہو۔ اس کی کامیابی کے لیے تو لازمی شرط یہی ہے کہ اپنے عہد کے تمام انسانوں میں سے بہتر اور صالح تر افراد کو نکال کر اپنی تنظیم کی طرف کھینچ لائے اور ان کی قابلیتوں سے کام لے۔ اگر وہ کسی خاص قوم کی ذاتی اغراض کا حامی بن جائے تو ظاہر ہے کہ دوسری قوموں کے لیے اس کا اپیل قطعاً غیر مؤثر ہو جائے گا۔

خامساً وہ کسی خاص قوم کی موروثی کلچر اور روایتی رسوم و عادات سے اپنا دامن نہیں باندھتا بلکہ ہر عہد میں تمام عالم انسانی نے اپنی علمی تلاش و جستجو سے جو حقائق — نظریات نہیں بلکہ حقائق —



دریافت کیے ہوں، یا اپنی سعی و عمل سے جو صالح نتائج پیدا کیے ہوں، ان سب کو لے کر وہ اپنے تجویز کردہ نظام اجتماعی میں اپنے اصول کے مطابق اس طرح جذب کرتا ہے کہ وہ اس نظام کے فطری اجزاء نہ کہ دراصل شدہ اشیاء بن جائیں۔

سادسا اس کی کامیابی کے لیے صرف یہ ثابت کر دینا کافی نہیں ہوتا کہ وہ بجائے خود برحق ہے اور اس میں انسان کے لیے فلاح ہے۔ بلکہ اپنے مقصود کو پہنچنے کے لیے وہ اس امر کا اقتضاء کرتا ہے کہ اس کے اصولوں کو ایک جنگ آزما تحریک کی بنیاد بنا دیا جائے، اس پر ایمان رکھنے والے اس تحریک کے زور سے ایک مجاہد جماعت بن کر اٹھیں، اور بالآخر اس کے نظریات ایک اسٹیٹ کے لیے بنیادی قانون بن جائیں۔

یہ اسلام کے مقتضیات ہیں اور یہی مسلمان ہونے کے مقتضیات بھی ہیں۔ اب اگر آپ "اسلامی جماعت" بن کر کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی اس قومی پالیسی پر نظر ثانی کرنی ہوگی جس پر آپ اب تک چلتے رہے ہیں، اور اسے بالکل بدل کر ان مقتضیات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

آپ کو اپنے دماغ سے قومی مفاد کا تصور نکال دینا پڑیگا اور اس کی جگہ اسلام کے اصول اور اس کے نسب العین کو دینی ہوگی۔ آپ کو وقتی اور مقامی مقاصد سے صرب نظر کر لینا ہوگا اور اپنی نظر اس ایک مقصد پر جمادینی ہوگی کہ اسلام کے اصول دینا میں حکمراں ہوں۔ اس غرض کے لیے آپ کو دنیا بھر سے لڑنے کے لیے تیار ہونا پڑے گا اور کسی ایسی پارٹی سے جو آپ کے اصول نہ مانتی ہو، آپ کسی شرط پر بھی سودا نہ کر سکیں گے۔ آپ کو سختی کے ساتھ ایک با اصول جماعت بننا پڑے گا، ان ناکارہ لوگوں کو اپنے سے الگ کرنا ہوگا جو آپ کے اصولوں کو نہ مانتے ہوں، اور سب قوموں میں سے ان سنا لعین کو چن چن کر اپنے ساتھ لانا ہوگا جو ان اصولوں کو مانتے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کو ابنِ اوتقی چھوڑ دینی ہوگی۔ اپنے اصولوں سے ہٹ کر آپ کچھ نہ کر سکیں گے خواہ اس میں کتنا ہی بڑا شخصی یا قومی فائدہ ہو۔ آپ کو ایک ایسی مجاہد جماعت



بننا پڑے گا جو اپنے اصولوں کے لیے لڑنے والی ہو جس کا مقصد اپنی قومی حکومت (National State) قائم کرنا نہ ہو، بلکہ اپنے اصولوں کی حکومت (Ideological State) قائم کرنا ہو۔

ایسی جماعت جب آپ نہیں گے تو آپ کو اپنی قیادت میں تغیر کرنا ہو گا۔ اس وقت آپ کے قائد صرف وہ لوگ ہو سکیں گے جو اسلام کے اصول کو ٹھیک ٹھیک جانتے ہوں اور سب سے زیادہ ان کا اتباع کرنے والے ہوں۔ ایک قوم کا لیڈر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو قوم کا فرد ہو۔ مگر ایک جماعت کا لیڈر صرف وہی ہو سکتا ہے جو جماعت کے مسلک کا سب سے بڑا علمبردار ہو۔ قومی تنظیم میں تو اسلام کے مسلک سے بچے ہوئے لوگ صف اول میں بھیجے جاسکتے ہیں مگر جماعتی تنظیم میں ان کا مقام سب سے پیچھے کی صفوں میں ہو گا۔ بلکہ شاید ان میں سے بہتوں کو کسی صف میں بھیجک نہ ملے گی۔

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ آپ پر دونوں راستے واضح ہو چکے ہیں۔ اب ان کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے بھی دیکھ لیجیے تاکہ انتخاب اور اختیار میں آسانی ہو۔

اگر آپ محض ایک ایسی قوم ہوں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہو، تو آپ کی حیثیت ایک جامد چٹان کی سی ہوگی، اور آپ کے مقابلہ میں دوسری ہیئت سی تو میں ایسی ہی چٹانوں کی صورت میں موجود ہوں گی۔ آپ کا اور ان کا مقابلہ اسی طرح ہو گا جس طرح چٹانوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ ایک چٹان دوسری چٹان میں سے اجزائے کر اپنا حجم نہیں بڑھا سکتی۔ نہ ایک چٹان دوسری چٹان کے حیر میں گھس سکتی ہے۔ ان کے درمیان معاملہ کی بس دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ہر ایک چٹان اپنے اپنے حیر میں رہنے پر قانع ہو۔ یا ایک چٹان دوسری چٹان پر چڑھ جائے اور اس سے ٹکرا کر اسے توڑنے اور پیسے کی کوشش کرے پہلی صورت میں آپ محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں آپ کے لیے وسعت کا امکان تو ہے، مگر اسی طرح کی وسعت جیسی فاشسٹ اٹلی اور نازی جرمنی حاصل کر رہا ہے، اور اس سے پہلے امپیرلیسٹ برطانیہ حاصل کر چکا ہے۔ اس طرح کی وسعت حاصل کر کے آپ دنیا میں بس ایک اور مفسد قوم کا اضافہ کر دیں گے جو زمین میں کچھ مدت تک فساد پھیلائے گی اور بالآخر اپنے کیے کی



سنراپائے گی۔

بجلاف اس کے اگر آپ اسلامی مفہوم کے مطابق ایک ایسی اصولی جماعت ہوں جو محض ایک ملک اور ایک جہانی نظریہ کے لیے جدوجہد کرتی ہو، اور جس میں ہر انسان آپ کے اصول قبول کر کے مساوی حقوق اور مساویانہ حیثیت کے ساتھ شریک ہو سکتا ہو، تو آپ ایک جامد پتھر کی طرح نہ ہوں گے بلکہ ایک نامی جسم کی طرح ہوں گے۔ آپ کی مثال اس درخت کی سی ہوگی جو ہر طرف اپنے گرد و پیش سے اجزاء جذب کرتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں آپ ایک عالمگیر طاقت World Force ہوں گے۔ آپ دنیا کو اپنے لیے نہیں بلکہ اصول حق کے لیے فتح کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر واقعی آپ کے اصول فطرت انسانی کو اپیل کرنے والے اور انسانیت کی مشکلات کو حل کرنے والے ہیں — جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں — تو دنیا خود اپنے آپ کو مستوحیت کے لیے آپ کے سامنے پیش کر دے گی۔ آپ کے شخصی یا قومی مفاد میں تو کوئی عالمگیر کشش نہیں ہے۔ اس کی طرف آپ دعوت دیں گے تو دنیا اس کی طرف خود بھی نہ کھینچے گی بلکہ آپ کو زبردستی اسے کھینچ پڑے گا۔ لیکن اسلام کے اصول میں عالمگیری کی طاقت ہے۔ دنیا ان کی طرف خود کھینچے گی بشرطیکہ آپ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے اصولوں کے لیے جنیں اور مریں۔ آپ کے سامنے اشتراکیت کی مثال موجود ہے۔ وہ ایک عالمگیر طاقت صرف اس لیے بنتی چلی گئی کہ اشتراکی لوگ اشتراکیوں کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ اشتراکیت کے اصول کے لیے جہاد کرتے رہے۔ آج اگر وہ اشتراکیت کے لیے جہاد کرنا چھوڑ دیں اور انھیں صرف اشتراکیوں کے مفاد کی فکر لگ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اشتراکیت کی عالمگیری ختم ہو جائے گی



# اقلیت و اکثریت

مسلمانوں نے چونکہ اپنے دین کو ایک عالمگیر تحریک کے بجائے ایک جامد قومی کلچر، اور خود اپنے آپ کو ایک بین الاقوامی انقلابی جماعت کے بجائے محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے لہذا اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت و اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے، اور اس کے لیے یہ بات سخت پریشانی کی موجب بن گئی ہے کہ سرشماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں چوگنی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں۔

یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب مسلمان کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اس کے ہوا نہیں سوچتی کہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے۔ اس صورت حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ اس اللہ کے بندے کو نہ تو اس طاقت کا علم ہے جو اس کے دین کی صورت میں اس کے پاس ہے، اور نہ اسے یہی خبر ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں اس کا مقام کیا ہے۔ یہ اپنے دین کو ایک کندہ ہتھیار اور اپنے آپ کو ایک ”قوم“ سمجھ رہا ہے اسی وجہ سے اس کو بچاؤ کی پڑ گئی ہے۔ اگر اس کو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں اور وہ جماعت ہوں جس کا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفہ اجتماع (Social Philosophy) کی طاقت سے فتح کرنا ہے تو ہر گز اسے کوئی پریشانی پیش نہ آتی۔ اس کے لیے اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔

کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ ”جماعتوں“ کے لیے نہیں۔ جو



جماعتیں کسی طاقت و نظریہ اور جان دار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلیل تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۳۲ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے، اگر وہ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے، اور روم پر ماتحت کرتے وقت ۳ لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالیوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جاسکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانے کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلیلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے، اور محدود اغراض کے لیے لڑنے کے بجائے ایسے اصولوں کے لیے لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے اور انسانی توہمات کو اس جماعت کی طرف کھینچنے والے ہوں۔ اسلام کے اصول اس غرض کے لیے بہترین پروگرام دے سکتے ہیں اور اس پروگرام کو لے کر اگر مسلمان علی مجاہدے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو چند سال میں حالات کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ لیکن یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں، نہ ان کو اس منبع کی خبر ہے جہاں اسلام کی قوت تسخیر چھپی ہوئی ہے۔ ان کے دماغوں کی پہنچ زیادہ سے زیادہ جہاں تک ہو سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یا تو اپنے آپ کو قلیل التعداد دیکھ کر محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کی فکر کریں یا اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ہمارے لیے دوسروں کے پیچھے چلنے اور اپنے آپ کو غیر مسلموں کی قیادت کے حوالے کر دینے کے سوا کوئی زندگی نہیں۔

دنیا میں اس وقت جتنی جماعتیں برسرِ اقتدار ہیں ان میں سے کسی جماعت کی تعداد بھی لاکھوں سے متجاوز نہیں ہے۔ غالباً روسی کمیونسٹ پارٹی اس وقت سب سے بڑی جماعت ہے، مگر جیسا کہ ابھی میں نے



بیان کیا اس کے ارکان بھی ۳۲ لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کہنا بڑے گاکہ جس نظریہ و مسلک کے حامیوں کی تعداد صرف ایک ملک میں آٹھ کروڑ اور دینا بھر میں چالیس کروڑ یا اس سے زیادہ ہو اس کو تمام کرہ زمین پر حکمران ہونا چاہیے۔ یہ نتیجہ یقیناً رونما ہوتا اگر ان لوگوں میں جماعتی حس بیدار ہوتا، اور انھیں اپنی جماعت کے مشن کا شعور نصیب ہوتا، اور یہ اس مشن کے لیے سعی و جہد پر کمر بستہ ہوتے۔ لیکن جس چیز نے اس عظیم الشان تعداد کو بالکل بے اثر قطعی ناکارہ بنا دیا ہے وہ اسی احساس و شعور اور اسی آمادگی عمل کا فقدان ہے مختلف قسم کی شیطانی قوتیں اس جماعت کو چمٹ گئی ہیں اور پیہم اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کسی طرح یہ اپنے آپ سے واقف نہ ہونے پائے، اور اس کو کبھی اتنا ہوش ہی نہ آئے کہ یہ اپنی زندگی کے مشن کا خیال کر سکے۔ آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لے لیجیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ایک نہ ایک شیطان اس قوم کی جان کا لاگو بنا ہوا ہے، اور پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے۔ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیطا طین مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے ان مسائل پر بحثیں چھیڑتے اور نزاعیں برپا کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات سر پھٹتوں تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس طرح مسلمانوں کا سارا مذہبی جوش ان کی اپنی تخریب میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ سردہری پیدا ہو گئی ہے وہاں کچھ دوسری قسم کے شیطا طین نمودار ہوتے ہیں، اور وہ دنیوی ترقی و خوش حالی کا سرباغ دکھا کر مسلمانوں کو ایسی تحریکوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں جو اپنے مقاصد اور طریق کار کے لحاظ سے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔

جن لوگوں کو مسلم عوام کی حالت دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس گئی گزری حالت میں بھی ان لوگوں کے اندر اچھی خاصی اخلاقی طاقت موجود ہے جس سے بہت کچھ کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بہت سے روگ جو اس قوم کو لگے ہوئے ہیں، انھوں نے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اس عظیم الشان تعداد کو



صفر کے درجے تک نیچے گرا دیا ہے۔ اسلام جس مقصد کے لئے جہاد اور محنت و جان فانی چاہتا ہے، یہ اس سے بہت دور ہٹا دیے گئے ہیں۔ ان کے ذہن سے اسلام کا صحیح تصور اور مسلمان کا حقیقی مفہوم نکال دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت خود اپنے آپ سے بے گانہ کر دیے گئے ہیں۔ جو اسلام ان کے اندر پایا جاتا ہے اس کے لیے کوئی مستقبل نہیں، کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔

ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لیے قریب قریب بالکل بے کار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھر دسہہ پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دو چار ہونا پڑے گا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو امید وابستہ کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام از سر نو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں اپنے اصول کی حکمرانی و فرماں روائی قائم کرنے کے لیے نبرد آزما ہو، تو شاید غیر مسلموں کی نسبت ان مسلمانوں میں سے اس کو کچھ زیادہ والنظر نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ مل سکیں گے۔

اب جو لوگ حقیقت میں اُس اسلام کو جانتے اور سمجھتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، اور جن کا قلب اس امر پر پوری طرح مطمئن ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت اسی اسلام کی حکمرانی میں ہے اور صرف اسلام ہی کے اصول پر انسانی تمدن و اجتماع کا ایک معتدل و متوازن نظام تعمیر ہو سکتا ہے، ان کو چند غلط فہمیوں سے اپنے ذہن کو صاف کر لینا چاہیے اور چند حقیقتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں:

اول یہ کہ مسلمانوں کے مفاد سے اسلام کا دامن باندھنا غلطی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ سوال بہ گنہ گوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ اسلام اپنے پیروؤں کے اس مفاد کو تسلیم کرتا ہے کہ ایک غیر الہی نظام حکومت کو چلانے کے لیے کتنے مسلمانوں کی خدمات فوج میں اور کتنوں کی پولیس میں اور کتنوں کی دفتروں میں حاصل کی جاتی ہیں، اور کتنی نشستیں ان کو مجالس قانون ساز میں ملتی ہیں تاکہ خدا کے ملک میں وہ بھی غیر مسلموں کی طرح شریعت ساز بن کر بیٹھیں، اور کن ریاستوں کی مسند حکمرانی مسلمان فرمانرواؤں کے لیے



محفوظ رکھی جائے تاکہ وہ غیر مسلم راجاؤں کی طرح ملک خدا کے ناجائز مالک بنے بیٹھے رہیں۔ اس قسم کے سوالات کو اسلامی سوالات کہنا اسلام کی توہین ہے۔ ایک اسلامی تحریک کو اس قسم کے تمام سوالات سے قطعاً بے تعلق ہونا چاہیئے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کی کامیابی نہ تو ان مسلمانوں کی تعداد اور طاقت پر منحصر ہے جو اس وقت مردم شماری میں مسلمان کی حیثیت سے لکھے ہوئے ہیں، اور نہ اس کی کامیابی کی راہ میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی کثرت تعداد ہی کوئی مضبوط رکاوٹ ہے۔ مردم شماری کے رجسٹروں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب دیکھ کر یہ گمان کرنا کہ اسلام کی طاقت ہندوستان میں صرف اتنی ہی ہے جتنا آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ہے، اور یہ سمجھنا کہ آبادی میں غیر مسلموں کا تناسب جتنا زیادہ ہے اتنا ہی اسلام کی کامیابی کا امکان کم ہے، یہ صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اسلام کو محض ایک جامد مذہبی رسم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک کی حیثیت سے میدان میں آجائے اور اس کے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک عملی پروگرام لے کر کوئی منظم جماعت اٹھ کھڑی ہو تو یقین رکھیے کہ اس کا اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہ رہے گا بلکہ شاید ان سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گا اور کوئی طاقت اس میں رواں کو نہ روک سکے گی۔ آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہ بسے عافیت میں پہنچا دیا جائے، افسوس ہے کہ وہ اسلام کے ان امکانات سے ناواقف ہیں۔

تیسرے یہ کہ کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ اس کے حقیقی معتقدوں اور پیروؤں کی تعداد ملک میں ۶۰ یا ۷۰ فی صدی ہو جائے۔ تاریخ کے واقعات اور خود موجودہ دنیا کے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک مضبوط اور منظم پارٹی جس کے ارکان اپنی تحریک پر پورا ایمان رکھتے ہوں، اور اس کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، اور پارٹی ڈسپلن کی کامل اطاعت کرتے



ہوں۔ محض اپنے ایمان اور ڈسپن کی طاقت سے برسرِ اقتدار آسکتی ہے خواہ اس کے ارکان کی تعداد ملک کی آبادی میں ایک فی ہزار بھی نہ ہو۔ پارٹی کا پرگرام کروڑوں کو اپیل کرتا ہے اور کروڑوں کی ہمدردی حاصل کرتا ہے، مگر خود پارٹی کے اندر صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ایمان اور اطاعت امر کے اوصاف کمال درجے پر رکھتے ہوں۔ پس اسلام کو حکمران بنانے کے لیے حقیقی مسلمانوں کی کسی طرح کی تعداد کی ضرورت نہیں۔ تھوڑے ہی کافی ہیں بشرطیکہ علم اور عمل کے اعتبار سے مسلمان ہوں اور خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر مستعد ہوں۔



# شکایات

ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

”آپ کی نظر میں نہ موجودہ بیڈروں میں، نہ عوام میں کوئی اس قابل ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے یا کہلانے کا مستحق ہو، نہ موجودہ دود کی سیاسی کشمکش میں ان نام نہاد مسلمانوں کی یہودی کی جدوجہد مستحسن ہے۔ پھر برائے خدایہ بتائیے کہ یہ مسلمان کس نام سے پکارا جائے اور اس پر جو ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان سے بچنے کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟

یہ سچ ہے کہ دو بھانسر کے مسلمان بوسے ہیں۔ مذہب کی پابندی نہیں کرتے۔ لیکن تاخیر کیا نہیں ڈوبتا ہی چھوڑ دیا جائے؟..... کیا جس وقت تک سب ماہ راستہ پر نہ آجائیں اس وقت تک د اپنے آپ کو کوئی مسلمان کہے نان کی بہتری کے واسطے انہیں جیسے مسلمانوں کی طرف سے کوئی جدوجہد کی جائے؟..... ڈوبتے ہوئے سے یہ کہنا کہ تو گھر سے پانی میں گیا ہی کیوں تھا اور تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے سراسر ظالمانہ انسانیت ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اسے نکالنے کی کوشش کی جائے اور ہر ممکن تدبیر اس کی جان بچانے کی عمل میں لائی جائے۔“

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:

”آپ کی روش میرے لیے اور مجھ جیسے خیالات رکھنے والے بہت سے لوگوں کے لیے سخت وجہ پریشانی بن گئی ہے۔ جب تک آپ نیشنلسٹ مسلمانوں یا کانگرس سے تعاون کرنے والے مسلمانوں کے طرز عمل پر تنقید کرتے رہے، ہم نے یہ سمجھا کہ آپ ہندوستان میں مسلمانوں



کی انفرادیت برقرار رکھنے کے حامی ہیں اس لیے ان لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں جن کے رویہ سے آپ کو خطرہ ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی ہستی گم ہو جائے گی۔ مگر اب آپ نے ان دو تحریکوں اور ان کے لیڈروں پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی ہے جو اس انفرادیت کے تحفظ ہی کے لیے کوشاں ہیں یعنی مسلم لیگ اور خاکسار تحریک۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں ہندوستان میں اگر مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے تو یہ حالات ضروری ہے کہ وہ کسی مرکز پر جمع ہوں ایک منظم گروہ بنیں، کسی قیادت کے تحت حرکت کریں۔ اس مقصد کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے اس سے آپ کا اختلاف کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ مذہبیت کا اچار چاہتے ہیں تو یہ بھی تب ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی نظام بن جائے۔ فی الحال بُری یا بھلی، جیسی بھی ہے، جماعت تو بن رہی ہے۔ اس کا ساتھ دیجیے۔ پھر مذہبی اچار کے لیے بھی کوشش کریجیے گا۔ لیکن آپ کی روش سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں سے کسی کا بھی ساتھ آپ دینا نہیں چاہتے۔

یہ دو خط منجملہ اُن بہت سے شکایاتی خطوط کے ہیں جو پچھلے دنوں مجھے وصول ہوئے ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک بہت بڑا گروہ اسی طرز پر سوچ رہا ہے اور ان خطوط میں دراصل اسی طرز خیال کی ناسندگی کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اوپر آپ تنقید کرنا اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینا کوئی خوش آئند چیز نہیں ہے۔ میں بھی اس کام کو خوش آئند سمجھتا ہوں مگر یہی کہتا ہوں، بڑا تلخ گھونٹ، زہر کا گھونٹ ہے جسے حلق سے اُتارتا ہوں، اور اچھی طرح اس تلخی کو محسوس کرتا ہوں جو میرے دوسرے بھائی اس کے اندر پاتے ہوں گے۔ اس احساس کے باوجود میرا ضمیر تقاضا کرتا ہے کہ اس تلخی سے بچنے کے بجائے اسے گوارا کرنا چاہیے۔ تلخی تو مائع میں موجود ہے، تغافل کا فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی تلخی کے اظہار



سے محال کر لیا جائے۔ دوسروں کی چیرہ دستیوں اور جبار خانہ کارروائیوں پر شکوہ سنج ہونا اور اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے صرف غفلت برتنا بلکہ ان کے لیے جو اذیتاں ان کے دلائل ڈھونڈنا بہت خوشگوار چیز ہے جن سے دل خوب بہتا ہے، مگر اس کی حقیقت ماریا کے انجکشن کی سی ہے۔ یہ ایک پینک ہے جس کے نشہ میں مریض سو تو جاتا ہے، مگر وہ اندرونی خرابیاں دور نہیں ہوتیں جن کے سبب بیرونی آفات کو اس پر تسلط حاصل ہوا ہے۔ میرے بھائی چاہتے ہیں کہ میں بھی انھیں اسی پینک کی خوراکیں دیا کروں۔ ان کی خواہش ہے کہ جس خیالی جنت میں وہ جی رہے ہیں جن سراپوں سے وہ چشمہ آب حیاں پانے کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، اور جن غلط فہمیوں کا دلفریب طلسم انھوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رستے دون۔ بلکہ اگر موسیٰ تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جائیں جن کے لیے ان چیزوں کا سراپنا دین اور امت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں، مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے محبوب دشمن کے بجائے مبغوض دوست بننا زیادہ مرغوب ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد پر طبیعت است اور عمر نہیں آتی

مسلمانوں کا مفاد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود مسلمانوں کی تنظیم مسلمانوں کی جمعیت و مرکزیت مسلمانوں کی ترقی و خوش حالی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر بار بار زبانوں پر آتا ہے۔ میں بھی یہ ذکر کرتا ہوں، زید بھی کرتا ہے، بکر بھی کرتا ہے۔ ..... ایک شخص جو اس گروہ میں شامل ہے، انہی الفاظ سے اپنے دعا کے اظہار میں کام لیتا ہے، مگر اس کے باوجود ہمارے عمل کی راہوں میں اختلاف ہے۔ ایک کسی طرف جا رہا ہے، دوسرا کسی اور طرف، تیسرا کسی اور طرف۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا پچھن آفاقی امر ہے؟ یا اس کی تہ میں کوئی بنیادی سبب ہے جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان الفاظ مشترک ہیں مگر معنی و مفہوم میں اختلاف ہے۔ ایک ہی لفظ ہے مسلمان، لیکن میں اس سے کچھ اقل مراد لیتا ہوں، اور دوسرے اس کا مفہوم



کچھ اور سمجھتے ہیں۔ اسی بہت مفاد، فلاح و بہبود تنظیم، جمعیت و مرکزیت، ترقی و خوش حالی اور ہر ایک چیز جو لفظ مسلمان کی نسبت سے بولی جاتی ہے، ہمارے درمیان مختلف المعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی الجھن کے سبب سے غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں، اور جب لوگ اسے سمجھانے سے عاجز رہ جاتے ہیں تو تشکیلات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تم کو مسلمانوں کے مفاد اور فلاح و بہبود اور ترقی و خوش حالی وغیرہ سے ہمدردی نہیں، جمعیت بن رہی ہے، مرکزیت پیدا ہو رہی ہے، مگر تم اس کی مخالفت کرتے ہو۔ مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام ہوتا ہے اور تم اس میں روڑے اٹھاتے ہو۔ حالانکہ ایک شخص ان الفاظ کا اطلاق جو مخصوص و متعین چیزوں پر کرتا ہے، دوسرے کے نزدیک ان پر یہ الفاظ منطبق ہی نہیں ہوتے، ورنہ ظاہر ہے کہ کون کا فر ہو گا۔ بس کوئی غلبہ فلاح مسلمین وغیرہ سے دشمنی ہو۔

آئیے، ذرا تحقیق کر کے دیکھیں کہ اس الجھن کی نوعیت کیا ہے۔

مطلق اور مفید کا فرق ایک ایسی واضح چیز ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا لفظ بولتے ہیں جس میں اطلاق اور مضمون ہو تو اس کے استعمال میں دعوت ہوتی ہے۔ اور حسب اسے مفید کر دیا جاتا ہے تو اس قید کا لحاظ کیے بغیر اس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ہم رنگ بولتے ہیں تو اس کا استعمال ہر رنگ پر ہو گا۔ کوئی چیز خواہ سیاہی میں ترقی کرے، یا سفیدی میں یا سرخی میں، یہ حال ہم نہیں دیکھتے کہ اس کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مگر جب رنگ کے ساتھ ہم مفید کی قید لگا دیں تو سیاہ، سرخ، سفید اور دوسری رنگ کی چیزوں پر ہم اس لفظ کا اطلاق نہ کر سکیں گے، اور سیاہی یا سرخی میں ترقی کرنے کو سفید رنگ کی ترقی کہنا صحیح نہ ہو گا۔ اسی طرح مثال کے طور پر لفظ قافلہ کو لیجیے۔ یہ قافلہ جو کسی طرف جا رہا ہو، اس لفظ سے مراد وہ ہو سکتا ہے جس طرف بھی وہ چلے، اس کی پیش قدمی کو قافلہ کی پیش قدمی کہا جاسکتا ہے۔ ہر شخص اس کا مفید قافلہ بن سکتا ہے۔ ہر گاڑی پر وہ سفر کر سکتا ہے۔ ہر شہر کا راجہ سفر اس کا راجہ ہو سکتا ہے۔ غرض اصل کے معنی ہونے کی وجہ سے ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو مطلق ہی ہو گی۔ لیکن جب مثلاً عزم پشاور



کی قید سے متقید کر کے قافلہ پشا در کہہ دیا جائے تو پھر وہ عموم باقی نہیں رہ سکتا جو محض قافلہ ہونے کی صورت میں تھا۔ قافلہ پشا در کا اطلاق صرف اسی قافلہ پر ہوگا جو عازم پشا در ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جاتو رہا ہو مگر اس یا بمبئی کی طرف اور کہلائے قافلہ پشا در۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو، پشا در کی قید سے متقید ہو جائے گی۔ مثلاً قافلہ پشا در کی پیش قدمی کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ پشا در کی سڑک پر چل رہا ہے۔ اگر وہ کسی دوسری سڑک بڑھ رہا ہو تو اسے قافلہ پشا در کی پیش قدمی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اسے پیش قدمی کے بجائے رجعت کہا جائے گا۔ کیونکہ دوسرے راستہ پر وہ جتنے قدم بھی چلے گا پشا در کی نسبت سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اس کا میر قافلہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو پشا در کا راستہ جانتا ہو۔ دوسرے راستوں کے علم میں کوئی شخص خواہ کتنا ہی ماہر ہو، اگر وہ پشا در کی راہ سے ناواقف ہے تو ہر حال وہ قافلہ پشا در کا سردار نہیں بن سکتا۔ اسی پر دوسرے تمام امور کو بھی قیاس کر لیجیے۔

اب دیکھیے کہ الجھن کس طرح پیش آتی ہے۔ قافلہ ہی کی مثال کو لے لیجیے۔ ایک قافلہ کا نام تو ہے قافلہ پشا در۔ مگر آپ یا تو پشا در کی قید کو بھول کر اسے محض قافلہ سمجھ لیتے ہیں۔ یا آپ کو پشا در کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ یا آپ کا خیال یہ ہے کہ اس قافلہ کے لوگ جب ایک دفعہ قافلہ پشا در کے نام سے موسوم ہو چکے ہیں تو اب یہ پشا در کے سوا اور کس طرح پرچا ہیں سفر کریں یہ حال انہیں کہنا چاہیے قافلہ پشا در ہی۔ بخلاف اس کے کہ میں قافلہ پشا در کو اس کے اصلی معنی میں لیتا ہوں اور پشا در کی قید کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قافلہ کے بارے میں جتنی گفتگو ہوتی ہے، میرے اوتار آپ کے درمیان بات بات پر تضادم واقع ہوتا ہے۔ جب تک بات محل رہتی ہے ہم متفق رہتے ہیں قافلہ کے منتشر مسافروں کو جمع کیا جائے، انہیں دوسرے قافلوں میں گم نہ ہونے دیا جائے، رہزنوں سے ان کی حفاظت کی جائے، ان کے لیے زاوراہ درکار ہے، انہیں ایک میر قافلہ کی ضرورت ہے، ان کو منظم طور پر تیز رفتاری سے منزل کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے، یہ سب باتیں مبہم اور محمل الفاظ میں جب



تک پہی جاتی ہیں، میں اور آپ دونوں ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ مگر جب انہی چیزوں کے تعین کا وقت آتا ہے تو آپ کے اور میرے خیالات میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ ایک شخص آتا ہے اور اس قافلہ کے لوگوں کو جمع کر کے بمبئی کی طرف چلنا شروع کر دیتا ہے، دوسرا آتا ہے اور کلکتہ کی طرف چل پڑتا ہے، تیسرا آتا ہے اور کسی اور طرف کا رخ کرتا ہے۔ آپ ہر میر قافلہ کے جھنڈے کو دیکھ کر زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں اور پکارتے ہیں کہ چل پڑا "پشاور کی قافلہ"۔ میں اسی پر اعتراض کرتا ہوں کہ یہ جمعیت اور یہ پیش قدمی قافلہ پشاور کی جمعیت اور پیش قدمی نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں متشر مسافر جمع تو ہو رہے ہیں اور صورت قافلہ تو بن رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بجا و درست مگر محض جمع ہونے اور صورت قافلہ بن جانے کا نام تو قافلہ پشاور بننا نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ دیکھو، کنسی چھی، تیر رفتار، شاندار گاڑی ہے جس پر یہ قافلہ جا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی بیان کردہ صفات سے انکار نہیں، مگر یہ گاڑی جا کہ عمر رہی ہے؟ اگر اس کا رخ پشاور کی طرف نہیں ہے تو قافلہ پشاور کے لیے موزوں نہیں۔ اس صورت میں تو اس کی تیر رفتار اور زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ یہ روز بروز قافلہ کو اس کی منزل مقصود سے دور ترے جاتی رہے گی۔ آپ کہتے ہیں کہ صاحب قافلہ بننے اور گاڑی چلنے تو دور پھر پشاور کی سڑک بھی ملے ہی نہیں گے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک غزم پشاور ملتوی ہے اور دوسرے راستوں پر آپ گامزن ہیں، اس وقت تک کے لیے نام تبدیل فرما لیجیے۔ مجھے آپ کی گاڑی چلنے پر اعتراض نہیں بلکہ اس پر ہے کہ آپ چلیں تو بمبئی یا مدراس یا کلکتہ کی طرف اور نام آپ کا قافلہ پشاور ہی رہے۔ آپ کہتے ہیں کہ حضرت پشاور کی سڑک تو بڑی دشوار گزار ہے، اس وقت اُدھر جانا تو محال ہے، لہذا سہرہ درست تو قافلہ پشاور کو دوسرے آسان راستوں ہی پر چلنے دو۔ میں گزارش کرتا ہوں کہ میں نے آپ کو دشوار گزار راستے کی طرف گھسیٹنے پر اصرار کیا تھا، میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ قافلہ پشاور کا پشاور کے سوا دوسری سمت میں چلنا اور پھر قافلہ پشاور ہی رہنا تناقض بات ہے۔ آپ اس تناقض کو دور فرمادیں۔



اس تمام بحث میں بنائے نزاع صرف یہ ہے کہ آپ مقید کو مطلق بناتے ہیں اور اس کے تمام  
 مستحقان کو قید سے آزاد کیے دیتے ہیں۔ اور میں مقید کو مقید ہی سمجھ کر بات کرتا ہوں۔ اگر آپ اپنے ذہن  
 کو صاف کر لیں اور یہ بات سمجھ لیں کہ مطلق قافلہ، اور قافلہ پشاور میں کیا فرق ہے تو کوئی الجھن پیش نہیں آسکتی  
 لیکن آپ بدھی سمجھ کی بات اختیار کرنے کے بجائے گفتگو کا رخ کچھ دوسری ہی باتوں کی طرف پھیر دیتے ہیں۔  
 کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ تم قافلہ کے اجتماع اور اس کی تنظیم اور اس کی پیش قدمی کے مخالف ہو۔ حالانکہ انفسم  
 و تنظیم اور انفسم پیش قدمی سے کس کا فرسہ اٹھا کر کیا تھا۔ کبھی آپ سوال کرتے ہیں کہ یہ قافلہ اگر قافلہ پشاور نہیں  
 تو اور کس نام سے یاد کیا جائے؟ حالانکہ اس کا نام تجویز کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میری بات قافلہ  
 ہے۔ اگر یہ پشاور کی سڑک پر ہے تو قافلہ پشاور ہے۔ اگر اس پر نہیں ہے تو اپنے لیے جو نام چاہے تجویز کرے۔  
 بہر حال اس پر قافلہ پشاور کا نام راست نہیں آتا۔ آپ چاہیں تو اس امر پر بحث کر لیجیے کہ جس سڑک پر یہ  
 جارہا ہے، وہ پشاور کی سڑک ہے یا نہیں۔ مگر یہ اصول آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو اس سڑک پر نہ ہو وہ  
 قافلہ پشاور نہیں ہے۔ پھر آپ ہمدردی کا سوال چھیڑ دیتے ہیں حالانکہ ہمدردی اور بے مددگی کا یہاں  
 کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو واقعہ اور حقیقت کا سوال ہے۔ ہمدردی یا ظلمت کی طرف جانے والوں کو  
 آخر میں عازم پشاور کس طرح کہوں؟ جانتے بوجھتے ایک خلاف واقعہ بات باور کرانا آخر ہمدردی کی کونسی  
 قسم ہے؟ میرے نزدیک ہمدردی کی صورت یہی ہے کہ صاف صاف لوگوں کو بتا دیا جائے کہ یہ پشاور  
 کی سڑک ہے اور یہ دوسری سڑکیں فلاں فلاں بہت کو جاتی ہیں۔ جو لوگ فی الواقع پشاور جانا چاہتے ہیں  
 مگر راستہ سے ناواقف ہونے کے باعث دوسرے راستوں پر بھٹک رہے ہیں یا بھٹکائے جارہے ہیں  
 وہ صحیح راستہ معلوم کر لیں گے۔ اور جو حقیقت میں جانا ہی دوسری طرف چاہتے ہیں میں نہ تو ان کا راستہ  
 روکنا چاہتا ہوں، نہ ان سے مجھے کوئی دشمنی ہے کہ انہیں انت کے خلاف ان کے ساتھ کوئی بے دردی کرنا  
 میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ عذر جانا چاہتے ہیں مجھ بوجھ کر پورے شعور کے ساتھ جائیں، اور جب جائیں تو



نظام نام کے ساتھ سفر نہ کریں۔

مسلمانوں کے معاملہ میں جواب کھن پیش آرہی ہے اس کی نوعیت بعینہ وہی ہے جو اوپر کی مثال میں بیان کی گئی ہے۔ مسلمان کا لفظ اسلام سے ماخوذ ہے اور اسلام ایک طریق فکر، ایک مقصد زندگی، ایک کیرکٹر اور ایک طرز عمل کا نام ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان کے ہی محض آدمی کے نہیں ہیں بلکہ اُس آدمی کے ہیں جو زندگی کے تمام معاملات میں وہ خاص طریق فکر، وہ خاص مقصد اور وہ خاص طرز عمل رکھتا ہو جس کا نام اسلام ہے۔ لفظ مسلمان کے ان تقیدات کو اگر صاف صاف سمجھ لیا جائے تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود، اُن کا مفاد، اُن کی تنظیم، اُن کی قیادت و امارت، عرض اُن سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا مفہوم میں ہو جائے گا۔ لیکن اگر ان تقیدات سے قطع نہ کر کے مسلمان کے لفظ کو مطلقاً ایک گروہ اشخاص کے معنی میں لے لیا جائے تو پھر ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ جس چیز کو چاہے مسلمان کا مفاد کہہ دے، جس چیز کو چاہے اُن کی فلاح و بہبود قرار دے۔ جس نوٹ کی تنظیم کو چاہے اُن کی تنظیم سمجھ لے، اور جو شخص جس انسانی گٹے کو پکٹنے کی قابلیت رکھنے والا دکھائی دے اُسے مسلمانوں کا قائد بن کر ادا میرِ مطاع ماننے پر آمادہ ہو جائے۔ بدقسمتی سے یہاں کچھ ایسی ہی صورت حال درپیش ہے۔ اسلام کی قید سے قطع نظر کے فی الواقع مسلمانوں و عین ایک گروہ اشخاص نہ لیا گیا ہے۔ ورنہ اسی کا نتیجہ ہے انبیاءِ عظیم جیہ وہ مسلمانوں کے مفاد و اُن کی فلاح و بہبود، اُن کی تنظیم و جمعیت، اُن کی قیادت و امارت وغیرہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مثلاً اُن کے لئے ہیں کہ مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ یہ مینک اور انشورنس اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ حاکمِ مسلمان کا لفظ اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اس کی مدد سے مسلمان امور ہیں اس پر کہ اُس پورے نظامِ مالیات کو توڑ دیا جائے اور اس وقت دنیا میں قائم ہے اور بنے اصول پر ایک نیا نظام بنائیں۔ پھر یہ لکھ ہوئے دماغ کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلمان کی حیثیت سے جس نظام کے ساتھ آپ کی اموی عداوت ہے اسی میں آپ اپنا مفاد سمجھیں اور پھر اُن کا نام مسلمانوں کا مفاد رکھیں؟ اسی طرح ہر کاری ملازمتوں



اور شریعت ساز مجالس کی نشستوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو مسلمان کے مفاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حالانکہ مسلمان کے لفظ کو اگر اسلام کی قید سے مقید کر کے لیا جائے تو یہ سب چیزیں مسلمان کے مفاد کی ضد

ہیں۔ مسلمان کے مفاد کی حیثیت سے تو آپ کا کام اس نظام حکمرانی کو بدل ڈالنا ہے جسے چلانے کو آپ

اپنا مفاد کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح وہ نظام تعلیم جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا ہے اس کے تحت اپنی نسلوں کا

ذہن تیار کرنا آپ کے نزدیک مسلمان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا ذریعہ ہے، اور اس نظام کے تحت آپ خود

اپنے خرق سے درسگاہیں بنا کر ان کے نام اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی رکھتے ہیں،

حالانکہ یہ پورا نظام تعلیم انسانیت کی تشکیل ایسے نقشہ پر کرتا ہے جو اسلامی نقشہ کے عین برعکس ہے۔

ایسا ہی غلط تصور آپ کے ذہن میں مسلمانوں کی جمعیت، مسلمانوں کی تنظیم اور مسلمانوں کی قیادت کا

بھی ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ اسلام کس تحریک کا نام ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اس کے اصول کیا ہیں،

اور وہ کیا طرز عمل چاہتا ہے، تو آپ بڑی آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان سیاسی جمعیات اور تنظیموں

اور ان قائدوں اور امیروں کی صحیح حیثیت کیا ہے جو اسلام کے نام سے اس وقت کام کر رہے ہیں۔ اسلام

کی رو سے مسلمانوں کی جمعیت صرف وہ ہو سکتی ہے جو غیر الہی حکومت کو مٹا کر الہی حکومت قائم کرنے اور قانون

خداوندی کو حکمراں کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ جو جماعت ایسا نہیں کرتی بلکہ غیر الہی نظام کے اندر مسلمان

نامی ایک قوم کے دنیوی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہے وہ نہ تو اسلامی جماعت ہے اور نہ اسے مسلمانوں کی

جماعت ہی کہنا درست ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی تنظیم صرف وہی ہو سکتی ہے جو خالص اسلامی اصول اجتماع

پر قائم ہو اور جس کا مقصد اسلامی ہو۔ ورنہ جو تنظیم فاشستی اصولوں پر کی جائے اور جس کا مقصد محض اپنی قوم کا

غلبہ و ممکن ہوا سے محض اس بنا پر مسلمانوں کی تنظیم نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مردم شماری کے مسلمانوں کو منظم کرتی

ہے اور ان کے "استخلاف فی الارض" کے لیے کوشاں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مسلمانوں کے رہنا بھی صرف وہی ہو

ہو سکتے ہیں جو رب سے پہلے اسلامی تحریک کے مقصد، اصول اور طریق کار کو جانتے ہوں اور اہل تقویٰ و دین



ہوں۔ باقی رہے وہ لوگ جو سرے سے اسلام کا علم ہی نہ رکھتے ہوں یا ناقص علم کی بنا پر اسلام اور جاہلیت کو خلط ملط کرتے ہوں اور پھر تقویٰ و دیانت کی کم سے کم ضروری شرائط سے بھی عاری ہوں، تو ایسے لوگوں کو محض اس لیے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرز تنظیم کے استاد فن ہیں، اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔ یہ باتیں جب مسلمانوں سے صاف صاف کہی جاتی ہیں تو وہ اس پر حیرت و حیرت ہوتے ہیں اور شکایات کے طومار باندھ دیتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اس معاملہ میں جذبات کی برائیت کی کوئی موقع نہیں ہے۔ لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ اسلام کے لیے اسلام کے اصول پر کام کرنا چاہتے ہیں یا اپنے بیٹے اپنے اصول پر۔ اگر پہلی بات ہے تو انہیں یہی طرح ہر اس چیز کو ترک کرنا چاہیے جو غیر اسلامی ہے۔ اور اگر دوسری بات ہے تو جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں حقوق سے کریں، ہم ان کا راستہ روکنے نہیں آتے، ہمارا مطالبہ ان سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقہ پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔



## راہِ روپشت بہ منزل

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی کام کرتے ہیں۔ ایک وہ جو حالات کو، جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں، جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں۔ اور ان کے مطابق کام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ انہیں کیا ہونا چاہیے۔ اور اس نقطہ نگاہ سے وہ حاضر الوقت نظام پر تنقید کرتے ہیں۔ پہلا گروہ حال کی گاڑی کو چلاتا ہے، اور دوسرا مستقبل کی اصلاح و ترقی کے لیے راستہ صاف کرتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں تعاون ضروری ہے، مگر ان کے تعاون کی فطری صورت یہی ہے کہ ان میں تصادم ہو۔

”کیا ہے“ پر نظر رکھنے والے ہمیشہ حال پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خوب ہو رہا ہے۔ اس میں کسی تنقید کی گنجائش نہیں۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو یہ وقت تنقید کا نہیں ہے، کیونکہ اس وقت تنقید کی جائے گی تو یہ یہ خرابیاں پیدا ہوں گی، اور فلاں فلاں مصلحتوں کو ٹھیس لگے گی۔ یہ سب باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی نگاہ وقتی مصالح اور فوری فوائد میں الجھی رہتی ہے۔ عاجز کی محبت انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ آجلہ کی فکر کریں۔ ان کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کوئی وقت بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہو گا خوب ہی ہو رہا ہو گا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ وقتی مسخیں ٹھیس کھانے کے لیے موجود ہوں گی، ہر وقت ان مصلحتوں کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ یہی کہیں گے کہ ابھی تنقید کا وقت نہیں ہے، اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود کبھی نہ بتا سکیں گے کہ کونسا وقت تنقید کے لیے موزوں ہے۔

لیکن جن کی فکر کیا ہو نا چاہیے“ پر ہوتا ہے وہ چونکہ حالات کو ایک دور ہی ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے وہ اسی وقت کو تنقید کے لیے موزوں سمجھتے ہیں جو اہل حال کے نزدیک سخت غیر موزوں ہوتا ہے۔ انہیں



ایسا کام پرستارانِ عاجزہ کی چیخوں اور فریادوں، بلکہ گالیوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اصلاح و ترقی ناممکن ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ مورہا ہے خوب مورہا ہے کی ذہنیت عام لوگوں پر مستولی ہو جانے کے بعد کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی۔ خامیوں کا احساس یا نو پیدا ہی نہیں ہوگا کہ انھیں دور کرنے کی طرف توجہ ہو، یا اگر تھوڑا سا احساس ابھرا بھی تو حال کے شیدائی اسے دبانے کے لیے میسوں قسم کی تاویلیں کریں گے، تاکہ ان کی خامیوں کو ناگزیر ثابت کریں اور بس چلے تو خوبیوں میں تبدیل کر دکھائیں۔

”کیا مونا چاہیے“ کے نقطہ نظر سے جو تنقید کی جاتی ہے اس کا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوتا کہ حال میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل خراب ہو جائے، اور اُس وقت تک جمود و تعطل کی حالت طاری رہے جب تک کہ وہ مثالی (IDEAL) حالت رونما نہ ہو جائے جسے مقصود قرار دے کر ناقد تنقید کرتا ہے۔ ایسا کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فطری طور پر تنقید کا اثر ہمیشہ تدریج ہوا کرتا ہے۔ اول اول تو اسے سخت تلخی اور ناگواری کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، کیونکہ عام طبیعتیں نقد سے، نوس اور نسبت سے نفور ہوتی ہیں۔ پھر ایک دور شبہات کا گذرنا ہے جس میں صداقت اور نیک نیتی کے سواہ ممکن چیز ناقد کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے بعد گہری مواقع تنقید میں کوئی جان ہوتی ہے اور حقیقت حاضر الوقت نظام میں وہ خامیوں پائی جاتی ہیں جن کی نشان دہی تنقید میں کی گئی ہے، اور عام لوگوں کی روح بھی حقیقت میں اسی معیار کو حق تسلیم کرتی ہے جسے مد نظر رکھ کر ناقد نے تنقید کی ہے، تب کہیں آہستہ آہستہ لوگ اصلاح کی ضرورت محسوس کوئی شروع کرنے ہیں، اور جوں جوں اصلاح کے حق میں اسے عام تیار ہوتی جاتی ہے، وقت کی قیادت پر دباؤ بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ بات تو کچھ نہیں قائدوں کو اپنی حالت اور اپنی پالیسی مدافعتی ہوتی ہے، یا پھر تنقید باز حالات کے اقتضار سے ایک نئی قیادت Leadership خود بخود اٹھوٹا یا رستہ آتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں کبھی تاریخی رفتار میں خلا یا نچوٹ پیدا نہیں ہوتی بلکہ تعطل کی وہ حالت نہیں آتی جس کی جب تک تصویر کھینچ کر اہل حال حاضر اسے صلح



دترقی کی ہر کوشش کو ہم قاتل ثابت کیا کرتے ہیں۔

کسی حالت کو مثال یا آئیڈیل قرار دے کر اس کے لحاظ سے حال پر تنقید کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم موجودہ حالت سے دفعۃً چھلانگ لگا کر اس مثالی حالت میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب عقل آدمی ظاہر ہے کہ ایسے طفرہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ تغیر ہر حال تدریجاً ہی ہوگا۔ مگر کسی صاحب عقل آدمی سے شاید یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ جس حالت کو مثال قرار دیتا ہو اس کے بالکل برعکس حالت کی طرف جانے پر کسی درجہ میں بھی راضی ہو جائے۔ وہ اگر ذوی العقول ہیں سے ہے تو اس میں کم از کم اس بات کی طلب بلکہ تڑپ ہونی چاہیے کہ حالات کی رفتار اسی منزل کی سمت میں ہو جسے وہ مقصود قرار دے رہا ہے، خواہ وہ ابتداءً چند قدم ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے خلافت راشدہ کے طرز کی قیادت، سیاست اور زندگی مثال کی حیثیت رکھتی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب جو مسلمانوں کا لیڈر ہو وہ فاروقِ عظیم سے کم نہ ہو اور اس کے ساتھی سب کے سب علی مرتضیٰ اور ابو عبیدہ بن الجراح اور عبدالرحمن ابن عوف کے ثیل ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ میری آخری منزل مقصود تو ہو وہ مقام جس پر صحابہ کرام تھے اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے میرے رہبر و رہنما ہوں وہ لوگ جو نہ اس راہ سے واقف ہیں، نہ اس کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، بلکہ اس کے عین مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں سطح زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو بہر حال میں وہی ذریعہ تلاش کروں گا جو مجھے اوپر کی طرف لے جاسکتا ہو، خواہ ابتداءً وہ مجھے دس فیٹ سے زیادہ نہ اٹھائے۔ ایسا ذریعہ مجھے نسلے گا تو میں سطح زمین ہی پر قیام کرنا پسند کر لوں گا۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ میں اوپر جانے کے ارادے سے ایک برقی جھوٹے میں بیٹھ کر کسی کو نسلے کی کان میں اُترنا شروع کر دیتا ہوں اور اس راستے سے اُس بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو کیا آپ کو میرے قاتل و قاتل ہونے میں ذرا سا شبہ بھی ہوگا؟ بالکل اسی طرح آپ کو میرے قاتل و قاتل میں اس وقت بھی شبہ نہ ہونا چاہیے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے



اور فاروقی حکومت کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ان لوگوں کے پیچھے چلا جا رہا ہوں جن کی عملی زندگی میں اور جن کے خیالات، نظریات، طرز سیاست، اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی تھنیٹ نہیں دیکھی جاسکتی، جن کا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انھیں قرآن کا نقطہ نظر نہ تو معلوم ہی ہے نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں، جن کو نور ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے، اسی کی طرف وہ رجوع کرتے ہیں، اور اس کے بعد اگر کوئی چیز ان کی نگاہ میں قابل لحاظ ہوتی ہے تو محض وقتی سیاست کی مصالحتیں جنہیں وہ خالص مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں؟

منزل مقصود وہ اور راستہ یہ! کون عقلمند یہ مان لے گا کہ اس چیز کو مقصود قرار دینے والا انسان اس راستہ پر قدم رکھنے کا خیال بھی کر سکتا ہے؟

پشت بمنزل چلنے والا تو خیر نادان بن کر چھوٹ سکتا ہے، مگر اس شخص کا معاملہ بڑا ہی عجیب ہے جو اپنے ہی آئیڈیل سے — جس کو وہ خود آئیڈیل کہتا ہو — گھبرائے، اس کا نام سن کر جیس جیس ہو جائے، اس کو پا مال ہوتے دیکھ کر افریں و مرجبا کے نعرے بلند کرے، اس کی حمایت کرنے والے کا منہ نوچے کے لیے دوڑے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جائے کہ آئیڈیل تو میرا وہی ہے۔ یہ آئیڈیل کی ایک بالکل ہی نرالی قسم دریافت ہوئی ہے جس سے ہم ابھی تک آشناء تھے۔ ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ آئیڈیل انسان کی محبوب ترین چیز ہوتی ہے۔ اس کا نام سن کر دلوں میں ترارت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر آدمی اس تک پہنچنے سے عاجز ہوتا ہے تو رنجیدہ

۱۔ اس عجائب کی دنیا میں جو عجیب باتیں سننے میں آتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے لیڈر اگرچہ قرآن سے ناواقف ہیں مگر پھر بھی جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ عین قرآن کے مطابق ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت ایک فضول چیز ہے، علم قرآن کے بغیر بھی انسان اس صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ بحیثیت جاہلیہ کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے!



اور غمگین ہوتا ہے۔ اگر کسی مجبوری سے اس کے خلاف چلنا ہے تو شرمندہ ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں اس غلط روی پر اسے ٹوک دیا جائے تو اس کی نگاہ شرم کے مارے اٹھ نہیں سکتی۔ مگر اب ہمارا تعارف اس نئی قسم کے آئیڈیل سے ہوا ہے جو ہے تو آئیڈیل ہی لیکن اس کا نام لے دیجیے تو چہرے بگڑنے لگتے ہیں۔ اس کی طرف چلنے کے لیے کہتے تو شدتِ غضب سے تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، اس کے خلاف چلنے پر ٹوکیے تو شرمندگی کے بجائے کمال دیدہ ویری و جبارت کے ساتھ تاویلیں کی جاتی ہیں، اس کی حمایت کرنے والے سے بڑھ کر نگاہ میں کوئی مغرض نہیں ہوتا، اور اسے پامال کرنے والوں سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں ہوتا۔ کیسا عجیب ہے یہ آئیڈیل اور کتنے عجیب ہیں اس کے پرستار!

طرفہ تماشا یہ ہے کہ کانگریس اور اس کے نیشنلزم کی مخالفت میں تو اسلام اور اسلامی کلچر کا نام لیا جاتا ہے، اور انہی ناموں کو نعرہ جنگ بنا کر مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت دی جاتی ہے۔ مگر جہاں یہ اسلام اور اس کی کلچر کا تحفظ کرنے والے جمع ہوتے ہیں وہاں اسی اسلام کے قوانین علانیہ توڑے جاتے ہیں، اسی کلچر کو ذبح کیا جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی ساری جنگ صرف اس لیے ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں اسلامی کلچر کا جھٹکا نہ ہونے پائے بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کو حلال کریں۔

وہاں مسلمان عورت اسی طرح تبرج جاہلیت کے ساتھ شمعِ انجمنِ بنی نظر آتی ہے جس طرح کوئی شرمیلی جی یا کوئی میم صاحبہ ہو سکتی ہیں۔ وہاں عین نماز کے وقت جلے ہوئے رہتے ہیں اور اگر بادل ناخواستہ ملتوی کیے بھی جاتے ہیں تو پیشواؤں سے لے کر پیروں تک شاذ و نادر ہی کوئی نماز کے لیے اٹھتا ہے۔ وہاں لباسوں میں نشست و برخاست میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں اسلامی کلچر کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ اور ایک معمولی مسلمان ان حامیانِ اسلام اور محافظینِ تہذیبِ اسلامی کی صحبت میں پہنچ کر اپنے آپ کو اتنا ہی حسنی محسوس کرتا ہے جتنا ہندوؤں اور پارسیوں کی کسی محفل میں کر سکتا ہے۔ وہاں کے مباحث آپ گھنٹوں سنتے رہیں مگر کھبے سے بھی کہیں قرآن و حدیث کا ذکر نہ آئے گا، کسی مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے اللہ اور



اس کے رسول کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا، بلکہ قرآن و سنت کا نقلہ نظر صریح طور پر ان کے سامنے رکھ دیا جائے تب بھی بلا تکلف اس کے خلاف طرز عمل اختیار کیا جائے گا۔ ان کی کمیٹیوں اور ان کے جلسوں میں آپ مسلمان کا ذکر بھی اس حیثیت سے نہیں گئے کہ اس کا کوئی جماعتی نصب العین بھی ہے، وہ دنیا میں کوئی اخلاقی منصب بھی رکھتا ہے، اور کوئی الہی مشن بھی اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ ان باتوں کے بجائے وہاں ساری گفتگو صرف اس حیثیت سے ہو گی کہ مسلمان کے نام سے جو ایک مجموعہ افراد پایا جاتا ہے اس کو دنیوی انفعالات سے کس طرح بچایا جائے اور دنیوی فوائد سے کس طرح متمتع کیا جائے۔ پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں ان کا حال کیا ہے؟ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جاتے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمت قبلہ کدھر ہے، اور اسباب پیش و مشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانا ز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے بیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان ایسے تو شہر کوئی صاحبِ دو فی صدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے۔ اٹا یا شارا لٹے۔

کیا وہ کلچر جسے کانگریس اور اس کی سنجیدگی و نینت سے بچنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، یہی ہے؟ اور یہی اس کے تحفظ اور احیاء کے ڈھنگ ہیں؟ اور انہی طریقوں سے ایسے ہی رہنماؤں کی قیادت میں اس کو ترقی دینا تک پہنچا جائے گا جسے مہتممائے نظر اور نصب العین قرار دیا جاتا ہے؟ — یہ سوال اتنا خطرناک ہے کہ اسے زبان پر لانا اپنی شہرت کو خود دعوتِ دینا ہے۔ آپ کی زبان سے اس سم اور اس کی ہر کا ذکر سننے ہی ہر طرف سے شور مچا ہو گا کہ یہ ایسا صدمہ ہے کہ ہر کام میں کرنی شروع کر دی ہے، آخر اس دیر کا یہ کون سا موقع تھا؟ دیکھتے نہیں کہ ابھی ہم کچھ کی حفاظت کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ مگر جمع ہونے کے دوران میں بھی کہیں کچھ کا تحفظ کیا جاتا ہو گا؟

یہی دھنگی اور لندہ منافی و حوزہ دشمنی ہے جسے دیر غیروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ مسلمانوں کو محض معاشی و سیاسی ہے اور تہذیب و مذہب کو محض دامنِ مسلمانی کے مذاکرات پر لکھنے کر کے یہ بہار



بنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حرکات کو دیکھ کر کون سمجھے گا کہ اپنے دین اور کلچر کی حمیت میں واقعی آپ مخلص ہیں۔ زبان سے کہیے کہ دل میں درد ہے، مگر ہاتھ سے بار بار پیٹہی کو بھینچے جیسے تو دیکھنے والا یہی خیال کرے گا کہ درد آپ کے پیٹ میں ہے نہ کہ دل میں۔ ایسی ہی باتوں سے ایک قوم کی ہوا اکھڑتی ہے اور دوسری قوموں کے دل سے اس کا رعب اٹھ جاتا ہے۔

تفرقہ و انتشار اور بے نظمی کے تلخ نتائج دیکھ کر مسلمانوں میں اجتماع و تنظیم اور مرکزیت کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہوا، مگر انسوس کہ عقل و خرد کی کمی نے اس مفید احساس کو بھی غلط راستہ پر لگا دیا۔ عام طور پر لوگ اب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ اجتماع اور مرکزیت بجائے خود رحمت میں لہذا جو مرکز سامنے آئے اس کے گرد جمع ہو جاؤ اور سب بل کر چلو، انشاء اللہ کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گے۔ گویا جس طرح کبھی یہ خط پیدا ہوا تھا کہ آرٹ محض آرٹ کی خاطر اور ادب محض ادب کے لیے اسی طرح اب یہ ایک نیا خط پیدا ہو رہا ہے کہ اجتماع بس اجتماع کی خاطر اور تنظیم محض بغرض تنظیم اور مرکزیت صرف مرکزیت کے لیے۔ حالانکہ ان چیزوں کے مفید ہونے کا تمام تر انحصار اجتماع کی روح اور تنظیم کے اصولوں اور مرکز کی نوعیت پر ہے۔ کسی غلط مرکز کے گرد بے مقصد جمع ہو جانا، یا غلط مقصد کے لیے جمع ہونا بجائے مفید ہونے کے اٹا مفر ہو جاتا ہے مسلمانوں کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ انحراف کا مصلح نظر کیا ہے اور وہ کس غرض کے لیے اجتماع اور تنظیم چاہتے ہیں۔

اگر آپ اصلی معنوں میں ایک ایسی مسلم جماعت کی تنظیم چاہتے ہیں جو اسلام اور اس کی تہذیب کا تحفظ کر سکتی ہو اور بالآخر اسلامی حکومت کی منزل تک پہنچ سکتی ہو، تو آپ کو جان لینا چاہیے کہ جو صورت تنظیم اس وقت بن رہی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس تنظیم میں جو لوگ سب سے آگے کی صف میں نظر آتے ہیں اسلامی جماعت میں ان کا صحیح مقام سب سے پیچھے کی صف ہے، بلکہ بعض تو وہاں بھی برعایت ہی جگہ پاسکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے پچھلے ڈبے کو انجن کی جگہ لگا دینا جس چڑھائی پر آپ



جانا چاہتے ہیں۔ یہ نام نہاد انجن آپ کی گاڑی کو اس طرف ایک اتنچ بھی بے کر نہیں جاسکتا، البتہ گاڑی اپنے وزن سے آپ نشیب کی طرف لڑھکے گی اور آپ لوگ کچھ مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے کہ ماشا اللہ ہمارا انجن اسے خوب اڑائے لیے جا رہا ہے۔ اس حقیقت کو جتنی جلدی سمجھ لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ہر لمحہ جو گزر رہا ہے وہ آپ کو اوپر کے پائے نیچے کی طرف لے جا رہا ہے۔ جو لوگ آپ کی تہذیب کو جلتے ہی نہیں وہ اس کا تحفظ کیا کریں گے؟ جو اس سے غدا نیہ بربر بغاوت میں کس طرح امید کی جاسکتی ہے کہ ان کے ہاتھوں سے اس کا احیاء اور ارتقاء ہو سکے گا؟ وہ اپنی زبان سے کچھ کچھ ضرور پکارتے ہیں، لیکن اگر حقیقت میں کچھ ہی کا درد ان کے دل میں اٹھا ہوتا تو یقیناً ان کی زندگیاں بدل گئی ہوتیں، ان کی ذہنیتیں بدل گئی ہوتیں۔ اور ان کا طرز فکر بدل گیا ہوتا۔ یہ علامت ان کی زندگیوں میں ناپید ہے، اور یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس گروہ میں حقیقی اسلامی جذبہ ہرگز مشتعل نہیں ہوا ہے۔

اور اگر اسلامی نصب العین آپ کے سامنے نہیں ہے بلکہ محض مادہ معنی میں ایک قوم کی نیشیت سے آپ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں، اور اپنے اندر نیشنلزم کی روح پیدا کر کے دوسری قوموں کے ساتھ کینیا مابقت کرنا آپ کا آخری مطمح نظر ہے، تو بلاشبہ آپ کو اپنے پیشواؤں میں اسلام کا رنگ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور مجھے آپ سے کسی بحث کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ کا راستہ جدا ہے اور میرا سیدھا راستہ وہی بات ہے کہوں گا جو اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی اس قوم پرستانہ تحریک کے لیے آپ کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اسلام ہر قوم پرستی کا دشمن ہے۔ خواہ وہ ہندوستان کی قوم پرستی ہو یا مام نہاد مسلم قوم پرستی۔

بعض حضرات اس قسم کے غیر اسلامی اجتماع اور مرکزیت کے حق میں قرآن و حدیث سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ کوئی بھی مذہب جو امت سے ہے اس کے التزام کا کلمہ یہ کیا ہے، دوسرے الگ ہونے یا الگ رہنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے، لیکن اس میں انہوں نے اس قدر غفلت یا کوشش نہ کی جتنی کہ اس کے مقابلہ میں



جسارت۔ قرآن تو اس مسجد تک میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتا جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو۔ اور یہاں تقویٰ کا نام لینے والے خطی سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کی رسی کو سب بل کر مضبوط تھا مو۔ اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ بس سب لوگوں کا متفق ہو کر کسی رسی کو تمام لینا ہی ذریعہ نجات ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اللہ کی رسی ہو یا نہ ہو۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ:

إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ

آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ

وَهُمْ سِرَافِعُونَ۔ (المائدہ - ۸)

مسلمانو! تمہارے حقیقی دوست اور ساتھی صرف اللہ اور

رسول اللہ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، جو نماز قائم

کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور خدا کے آگے جھکنے والے ہیں

بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا

الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمُ فِي الْبَرِّينَ (النساء - ۲)

پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تب

وہ تمہارا سب سے دینی بھائی ہیں۔

مگر یہاں نماز اور زکوٰۃ کی شرط کو محض بے معنی سمجھا جاتا ہے۔ برادری اور ولایت تو درکنار، امامت

اور سرداری تک کے لیے یہ چیزیں شرط نہیں ہیں۔ بلکہ خدا کی مقرر کی ہوئی ان شرطوں کا نام لے لیجیے تو تیوریل میں بل پڑ جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عادیث میں التزام جماعت اور اطاعت امام کے متعلق جو احکام ہیں اور من

شأن مشن فی الناس اور اسی قسم کی جو وعیدیں جماعت اور امام سے الگ ہونے والوں کو سنائی گئی ہیں، انہیں

کوئی واسطہ ان جماعتوں اور امامتوں سے نہیں ہے جو محض قوم پرستی کے اصولوں پر دنیوی اغراض کے لیے بنی

ہوں۔ وہاں تو التزام جماعت سے مراد دراصل اس جماعت کا التزام ہے جو دنیوی اغراض سے پاک ہو کر خالص

لوجہ اللہ اسلام کے مشن کی خدمت کے لیے بنی ہو۔ ایسی جماعت سے الگ ہونے کا نتیجہ یقیناً نارنجہنم ہے اور ہونا

چاہیے۔ مگر ان ہدایات کو دنیوی حجتہ بندی اور سیاسی پارٹیوں کی وفاداری کے لیے دلیل بنانا خدا کے رسول پر



بہتان گھڑنا ہے۔ کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں اگر معاشی یا سیاسی اغراض کے لیے جدوجہد کرنی ہو تو وہ عام قوانین طبعی کے مطابق اپنا جھٹکا بنائے اور قوت فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ اسے خدا کو پیچ میں لانے کا کیا حق ہے؟ دو قوموں کی خالص نفسانی کشمکش میں آخر خدا کو جانبدار بننے کی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ ایک کی جھجھندی سے الگ ہونے والوں کو تو وہ جہنم کی سزا دے اور دوسری کے جتنے کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ ہر اس شخص کے سامنے جہنم پیش کر دے جو اس سے الگ ہو یا الگ رہے؟

بعض لوگ اس سب میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوان عظم" ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ سواد عظم کا تھکاوٹ ہندو مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی تتبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ارشاد نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سواد عظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد اصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو جو حق اور باطل کی تیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔ اور اگر وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جائے تو اس پر زیادہ دیر تک جمی نہیں رہ سکتی۔ اسی بنا پر حضور نے سواد عظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی۔ مگر جو لوگ اس ضروری صفات سے عاری ہوں اور جن میں کھڑے اور کھدائے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو ان سے "بڑا کی" ماہر گزشتہ نام نہیں ہے۔ نہ ان کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے۔ نہ ان کی امارت اسلامی اصطلاح کی رو سے "امارت" ہے۔ نہ ان کی اس امارت پر کسی حیثیت سے بھی مجمع و دعوت کا حق پہنچتا ہے۔ بعض لفظ مسلمانان سے دعوہ کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس وحیت کی کوئی تنظیم اسلامی لفظ لفظ سے مفید ثابت ہوگی ان کی اندوختی مانع کی مستحق ہے۔



# اسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین

جب کسی شخص پر بار بار تشنج، ہڈیاں اور بجران کے دورے پڑتے ہوں اور درمیان وقفوں میں بھی وہ ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف سے بے تاب رہتا ہو تو اس کی حالت کو دیکھ کر عقلمند لوگ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟ وہ اسے محض ادھیری ضل کا اثر قرار دیتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خود اس کے اپنے نظام جسمانی کے اندر کوئی خرابی موجود ہے؟ تشنج کا علاج ہاتھ پاؤں باندھنے سے ہڈیاں علاج منہ بند کھنکھنے سے اور بخار کا علاج برف میں دبلنے سے کیونکہ یہ ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس اصل خرابی کو سمجھیں جو کارگاہ بدن کی ترکیب میں پیدا ہو گئی ہے اور ساری تدبیریں اسی کو دور کرنے میں صرف کر دیں؟

جہاں تک انفرادی حالات کا تعلق ہے، ہر صاحب عقل ایسے مواقع پر دوسری صورت ہی اختیار کیا کرتا ہے۔ مگر تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جو عقل ایک فرد کو اس حالت میں دیکھ کر صحیح نتیجہ اخذ کرتی ہے وہ کہاں ماری جاتی ہے جب پوری انسانیت اس کے سامنے اسی حال میں ہو۔ تمام عالم انسانی اس وقت ایک شدید بجران میں مبتلا ہے۔ اس پر تشنج کا ایک ایسا زبردست دورہ پڑا ہے جس سے ساری زمین دہل گئی ہے۔ اور یہ کوئی پہلا دورہ نہیں ہے۔ ایک مدت سے پیہم اس پر ایسے ہی دورے پڑ رہے ہیں۔ اور دوروں کے درمیان جو وقفہ گزرتا ہے اس میں بھی کبھی وہ چین سے نہیں رہتا۔ ہر وقت کسی نہ کسی درد سے بے چین ہی رہتا ہے۔ مگر باوجودیکہ مدتہائے دراز سے یہ صورت حال ساری دنیا میں مشاہدہ کی جا رہی ہے، کسی کا ذہن ادھر نہیں جاتا کہ انسانی تمدن و عمران کی اساس میں ایک بنیادی خرابی موجود ہے۔ ساری دنیا کے بوجھ بھکڑ اپنی اپنی نظریں صرف ان خارجی علامات ہی پر جمائے ہوئے ہیں جو اندرونی خرابی کی وجہ سے سطح پر نمایاں ہوتی ہیں۔



اور ہر ایک کو سطح پر جو پھوٹا سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اسی پر انگلی رکھ کر کہہ دیتا ہے کہ بس اس آپریشن کر دو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ بس کی گانٹھ ڈکٹیٹر شپ ہے، اس کو کاٹ دو۔ کوئی کہتا ہے کہ ساری خرابی اسپیریلزم کی وجہ سے ہے اسے مٹا دو۔ کوئی کہتا ہے کہ سرمایہ دار نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے، اس کا خاتمہ کر دو۔ ان نادانوں کی عقل کہاں گم ہو گئی ہے؟ یہ شاخوں کو جڑ سمجھ رہے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ جڑ کھیں اور ہے، اور وہ جب تک زمین پکڑے رہے گی، شاخیں برابر نکلتی ہی رہیں گی خواہ قیامت تک ان کو کاٹنے میں وقت ضائع کیا جاتا رہے۔

دنیا میں جہاں جو خرابی بھی پائی جاتی ہے اس کی جڑ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنا۔ یہی ام انجائنٹ ہے۔ یہی اصل بس کی گانٹھ ہے۔ اسی سے وہ شجر ضیعت پیدا ہوتا ہے جس کی شاخیں پھیل پھیل کر انسان پر مصیبتوں کے زہریلے پھل پھینکتی ہیں۔ یہ جڑ جب تک باقی ہے، آپ شاخوں کی جتنی چاہیں قطع و برید کر لیں، بجز اس کے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا کہ ایک طرف سے مصائب کا نرول بند ہو جائے اور دوسری طرف سے فروع ہو جائے۔

ڈکٹیٹر شپ یا مطلق العنان بادشاہی کو مٹایا جائے گا تو حاصل کیا ہوگا؟ یہی ناکہ ایک انسان یا ایک خاندان خدائی کے مقام سے ہٹ جائے گا اور اس کی پارلیمنٹ خدا بن جائے گی۔ مگر کیا فی الواقع اس طریقہ سر انسانیت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ کیا ظلم اور بغی اور فساد فی الارض سے وہ جگہ خالی ہے جہاں پارلیمنٹ کی خدائی ہے؟

اسپیریلزم کا خاتمہ کیا جائے گا تو اس کا حاصل کیا ہوگا؟ بس یہی کہ ایک قوم پر سے دوسری قوم کی خدائی اتر جائے گی۔ مگر کیا واقعی اس کے بعد زمین پر امن اور خوش حالی کا دور شروع ہو جاتا ہے؟ کیا وہاں انسان کو پسینہ نصیب ہے جہاں قوم آپ اپنی خدا بنی ہوئی ہے؟

سرمایہ داری کا استیصال ہو جائے گا تو اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ وہ یہ کہ محنت پیشہ عوام مالدار



طبقوں کی خدائی سے آزاد ہو کر خود اپنے بنائے ہوئے خداؤں کے بندے بن جائیں گے۔ مگر کیا اس سے حقیقت میں آزادی، عدل اور امن کی نعمتیں انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں؟ کیا انسان کو وہاں نعمتیں حاصل ہیں جہاں فردوروں کے اپنے بنائے ہوئے خدا حکومت کر رہے ہیں؟

اللہ کی حاکمیت سے منہ موڑنے والے زیادہ سے زیادہ بہتر نسل العین جو پیش کر سکتے ہیں وہ بیش ازین نیست کہ دنیا میں مکمل جمہوریت قائم ہو جائے، یعنی لوگ اپنی بھلائی کے لیے آپ اپنے حاکم ہوں۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ یہ حالت واقعی دنیا میں رونما ہو بھی سکتی ہے یا نہیں، غور طلب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت اگر رونما ہو جائے تو کیا اس فرضی جنت میں انسان خود اپنے نفس کے شیطان، یعنی اُس جاہل اور نادان خدا کی بندگی سے بھی آزاد ہو جائے گا جس کے پاس خدائی کرنے کے لیے علم، حکمت، عدل، راستی کچھ بھی نہیں، صرف خواہشات ہی خواہشات ہیں، اور وہ بھی اندھی جاہلانہ خواہشات؟

غرض دنیا کے مختلف گوتوں میں انسانی مصائب اور پریشانیوں کے جتنے حل بھی سوچے جا رہے ہیں ان سب کا خلاصہ بس اتنا ہی ہے کہ خدائی یا حاکمیت بعض انسانوں سے سلب ہو کر بعض دوسرے انسانوں کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور یہ مصیبت کا ازالہ نہیں ہے بلکہ صرف اس کا ازالہ ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ سیلاب بلا اب تک جس راستہ سے آتا رہا ہے اُدھر سے نہ آئے بلکہ دوسرے راستہ سے آئے۔ اس کو اگر حل کہا جا سکتا ہے تو یہ ایسا ہی حل ہے جیسے دق کی بیماری کو سرطان سے تبدیل کر لیا۔ اگر مقصود محض دق کو دور کرنا تھا تو بے شک آپ کامیاب ہوئے، لیکن اگر اصل مقصد جان بچانا تھا تو ایک پیام اجل کو دوسرے پیک اجل سے تبدیل کر کے آپ نے کوئی بھی کامیابی حاصل نہ کی۔

خواہ ایک انسان دوسرے کا خدا بنے، یا دوسرے کی خدائی تسلیم کرے، یا آپ اپنا خدا بن جائے پھر

سہ تجربات شاید ہیں کہ حقیقی جمہوریت آج تک دنیا میں کبھی قائم نہ ہو سکی، اور عقلی دلائل سے ثابت ہوتا ہے

کہ ایسا ہونا عملاً محال ہے۔



ان تمام صورتوں میں تباہی اور خسران کا اصل سبب جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ کیونکہ جو فی الواقع بادشاہ نہیں ہے وہ اگر بادشاہ بن بیٹھے، جو حقیقت میں بندہ اور غلام ہے وہ اگر اپنے آپ کو خواجگی و خداوندی کے مقام پر متمکن سمجھ لے، جو دراصل ذمہ دار اور مسئول رعیت ہے وہ اگر غیر ذمہ دار اور خود مختار حاکم بن کر کام کرنے لگے، تو اس ادعا کی اور ایسے ادعا کو تسلیم کرنے کی حقیقت ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ اصلیت جو کچھ ہے وہ تو بہر حال وہی کی وہی رہے گی حقیقت میں تو جو خدا ہے وہ خدا ہی رہے گا اور جو بندہ ہے وہ بندہ ہی رہے گا۔ مگر جب بندہ اس عظیم شان بنیادی غلط فہمی پر اپنی زندگی کی ساری عمارت اٹھائے گا کہ وہ خود حاکم اعلیٰ ہے یا کوئی دوسرا بندہ اس کا حاکم اعلیٰ ہے، اور جب وہ یہ سمجھ کر کام کرے گا کہ اس سے بالاتر کوئی حاکم نہیں ہے جس کے سامنے وہ جواب دہ ہو اور اپنے امر و نہی میں جس کی رضائینے کا محتاج ہو تو یقیناً اس کی زندگی کی عمارت از سر تا پا غلط ہو کر رہ جائے گی اور اس میں راستی و صحت کو تلاش کرنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

یہ بات آخر کس طرح انسان کی عقل قبول کر لیتی ہے کہ خلق کسی کی ہو اور امر کسی اور کا ہو؟ پیدا کرنے اور پالنے والا کوئی ہو اور حکم کسی اور کا چلے؟ ملک کسی کا ہو اور بادشاہت کسی اور کی ہو؟

جس نے انسان کو بنایا، جس نے انسان کے لیے زمین کی قیام گاہ بنائی، جو اپنی ہوا، اپنے پانی، اپنی روشنی اور حرارت اور اپنے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے انسان کی پرورش کر رہا ہے، جس کی قدرت انسان کا اور اس پروردگار کا، جس میں انسان رہتا ہے، احاطہ کیے ہوئے ہے اور جس کے جسطہ قدرت سے انسان کسی حال میں نکل ہی نہیں سکتا، عقل اور فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہی انسان کا اور اس زمین کا مالک ہو، وہی خدا اور رب ہو اور وہی بادشاہ اور حاکم بھی ہو۔ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں خود اس کے سوا اور کس حکومت و فرمانروائی کا حق پہنچتا ہے؟ کس طرح ایک ملوک یہ کہنے کا حق دار ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے ملوکوں کا مالک ہے؟ صنایع اور پروردگار کے سوا اپنی مصنوعات اور اپنے پروردگار کی ملکیت اور کس کے لیے جائز ہو سکتی ہے؟ کون اتنی قدرت رکھتا ہے، کس کے پاس اتنا علم ہے، کس کا یہ ظرف ہے کہ اس سلطنت



میں فرمانروائی کر سکے؟ اگر انسان اس مملکت کے اصلی سلطان کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت مانتا ہے یا خود اپنی حاکمیت کا ادعا کرتا ہے تو یہ صریح واقعہ کے خلاف ہے بنیادی طور پر غلط ہے۔ ایک عظیم الشان جھوٹ ہے۔ سب سے زیادہ سفید جھوٹ۔ ایسا جھوٹ جس کی تردید زمین و آسمان کی ہر شے ہر وقت کر رہی ہے۔ ایسے بے بنیاد دعوے، اور ایسی غلط تسلیم و اطاعت سے حقیقت نفس الامری میں ذرہ برابر بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جو مالک ہے وہ مالک ہی رہے گا، جو بادشاہ اور حاکم ہے وہ بادشاہ اور حاکم ہی رہے گا، البتہ خود اس انسان کی زندگی از سر تپا یا غلط ہو کر رہ جائے گی جو واقعہ کے خلاف دوسرے کی حاکمیت تسلیم کر کے، یا خود اپنی حاکمیت کا مدعی بن کر کام کرے گا۔ حقیقت اس کی محتاج نہیں ہے کہ تم اس کا ادراک کرو تب ہی وہ حقیقت ہو۔ نہیں! تم خود اس کے محتاج ہو کہ اس کی معرفت حاصل کر کے اپنی سعی و عمل کو اس کے مطابق بناؤ۔ اگر تم حقیقت کو محسوس نہیں کرتے اور کسی غلط چیز کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہو تو اس میں نقصان تمہارا اپنا ہے۔ تمہاری غلط فہمی سے حقیقت میں کوئی تغیر رونما نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ جس چیز کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہو اس کو جزوی ترمیمات اور فردعی اصلاحات سے کبھی درست نہیں کیا جاسکتا۔ ایک جھوٹ کے ہٹ جانے اور اس کی جگہ دوسرے جھوٹ کے آجانے سے حقیقت میں کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تبدیلی سے طفل لٹی تو ہو سکتی ہے مگر غیر حق پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کا جو نقصان ایک صورت میں تھا وہی دوسری صورت میں بھی علیٰ حالہ باقی رہتا ہے۔

اس نقصان کو دور کرنے اور انسانی زندگی کو حقیقی فلاح و سعادت سے ہم کنار کرنے کی کوئی دوسری صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ غیر اللہ کی حاکمیت سے کلیۃً انکار کیا جائے اور اس کی حاکمیت تسلیم کی جائے جو فی الواقع مالک الملک ہے۔ ہر اس نظام حکومت کو رد کر دیا جائے جو انسانی اقتدارِ اعلیٰ کے باطل نظریہ پر قائم ہو، اور صرف اس نظام حکومت کو قبول کیا جائے جس میں اقتدارِ اعلیٰ اسی کار ہے جو فی الحقیقت مقتدرِ اعلیٰ ہے۔ ہر اس حکومت کے حق حکمرانی کو ماننے سے انکار کر دیا جائے جس میں انسان بذاتِ خود حاکم اور صاحبِ امر و نہی



ہونے کا مدعی ہو، اور صرف اس حکومت کو جائز قرار دیا جائے جس میں انسان اصلی اور حقیقی حاکم کے ماتحت خلیفہ ہونے کی حیثیت قبول کرے۔ یہ بنیادی اصلاح جب تک نہ ہوگی جب تک انسان کی حاکمیت خواہ وہ کسی شکل اور کسی نوعیت کی ہو، جزو پیڑ سے اٹھاڑ کر نہ پھینک دی جائے گی، اور جب تک انسانی حاکمیت کے غیر واقعی تصور کی جگہ خلافت الہی کا واقعی (Realistic) تصور نہ لے لے گا، اس وقت تک انسانی تمدن کی بگڑی ہوئی کل بھی درست نہ ہو سکے گی، چاہے سرمایہ داری کی جگہ اشتراکیت قائم ہو جائے، یا ڈکٹیٹر شپ کی جگہ جمہوریت ممکن ہو جائے، یا امپیریلزم کی جگہ قوموں کی حکومت خود اختیاری کا قاعدہ نافذ ہو جائے۔ صرف خلافت ہی کا نظریہ انسان کو امن دے سکتا ہے، اسی سے ظلم مٹ سکتا ہے اور عدل قائم ہو سکتا ہے، اور اسی کو اختیار کر کے انسان اپنی قوتوں کا صحیح مصرف اور اپنی سعی و جہد کا صحیح رخ پاسکتا ہے۔ رب العالمین اور عالم الغیب والہ شہادہ کے سوا اور کوئی انسانی تمدن و عمران کے لیے ایسے اصول اور حدود تجویز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو بے لاگ ہوں، جن میں جانب داری، تعصب اور غود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو، جو ٹھیک ٹھیک عدل پر قائم ہوں جن میں تمام انسانوں کے مفاد اور حقوق کا یکساں لحاظ کیا گیا ہو، جو گمان و قیاس پر نہیں بلکہ حقائق فطرت کے فیضی علم پر مبنی ہوں۔ ایسے ضابطہ کی نعمتوں سے انسان صرف اسی طرح بہرہ ور ہو سکتا ہے کہ وہ خود صاحب امر اور قانون ساز بننے کے زعم سے دستبردار ہو جائے، خدا پر اور اس کے بھیجے ہوئے قانون زندگی پر ایمان لائے اور آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھتے ہوئے اس ضابطہ کو دنیا میں قائم کرے۔

اسلام انسانی زندگی میں یہی بنیادی اصلاح کرنے آیا ہے۔ اس کو کسی ایک قوم سے دلچسپی اور کسی دوسری قوم سے عداوت نہیں ہے کہ ایک کو چڑھانا اور دوسری کو گرانا اس کا مقصد ہو، بلکہ اسے تمام نوع انسانی کی فلاح و سعادت مطلوب ہے جس کے لیے وہ ایک عالمگیر کلیہ و ضابطہ پیش کرتا ہے۔ وہ ایک تنگ زانوہ سے کسی خاص ملک یا کسی خاص گروہ انسانی کو نہیں دیکھتا بلکہ وسیع نظر سے تمام روئے زمین کو اس کے تمام باشندوں سمیت دیکھتا ہے، اور چھوٹے چھوٹے وقتی حوادث و مسائل سے بالاتر ہو کر ان اصولی و بنیادی مسائل



کی طرف توجہ کرتا ہے جن کے حل ہو جانے سے تمام زمانوں اور تمام حالات و مقامات میں سارے فروعی و  
ضمنی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔ اسے ظلم کی شاخوں اور فساد کی فروعی شکلوں سے بچت نہیں  
ہے کہ آج ایک جگہ ایک شاخ کو کاٹنے پر زور صرف کیسے اور کل دوسری جگہ کسی دوسری شاخ سے طبع آزمائی  
کرنے لگے، بلکہ وہ ظلم کی جڑ اور فساد کے سرچشمے پر براہ راست حملہ کرتا ہے تاکہ ان شاخوں کی پیدائش ہی بند ہو جائے  
اور جگہ جگہ آئے دن کی کاٹ چھانٹ کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ضمنی مسائل جن میں آج دنیا کی مختلف قومیں اور جماعتیں الجھ رہی ہیں، مثلاً یورپ  
میں ہٹلر کا طغیان ناز، یا حبش میں اٹلی کا فساد، یا چین میں جاپان کا ظلم، یا ایشیا و افریقہ میں برطانیہ و فرانس  
کی قیصریت، اسلام کی نگاہ میں ان کی اور ایسے تمام مسائل کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کی نگاہ میں ایک ہی  
سوال اہمیت رکھتا ہے۔ وہ تمام دنیا کے انسانوں سے پوچھتا ہے:

اَعْرَبَابُ تَتَفَرَّقُونَ خَيْرًا اِمَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ؟

”متفرق چھوٹے چھوٹے خداؤں کی بندگی اچھی ہے یا اس ایک اللہ کی جو سب پر غلبہ و تسلط رکھتا ہے؟“

جو لوگ پہلی صورت کے پسند کرنے والے ہیں اسلام ان سب کو ایک سمجھتا ہے، خواہ وہ آپس میں کتنے  
ہی مختلف شعبوں میں بٹے ہوئے ہوں۔ ان کی ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد اسلام کی نظر میں ایک فساد  
کے خلاف دوسرے فساد کی جدوجہد ہے۔ ان میں سے کسی کی دشمنی بھی نفس فساد سے نہیں ہے بلکہ فساد کی کسی  
خاص شاخ سے ہے اور اس لیے ہے کہ جس فساد کا جھنڈا ایک فریق نے بلند کر رکھا ہے وہ سب گروہوں کو اس کی جگہ وہ فساد ستر  
ہو جس کا جھنڈا دوسرا فریق اٹھائے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فریقین میں سے کسی کے ساتھ بھی اس کا ترک عمل نہیں ہو سکتا جو اصل فساد کا  
شمن ہو۔ اس لیے تو ایک جھوٹے رب پرستاروں اور دوسرے جھوٹے رب کے بندوں میں ترجیح کا سوال ہی نہیں۔ اس کی تو بیک وقت سب  
سے لڑائی ہے۔ وہ تو اپنا سارا زور صرف ایک ہی مقصد پر صرف کرے گا اور وہ یہ ہے کہ انسان کو متفرق غیر  
حقیقی ربوں اور الہوں کی بندگی سے نکالا جائے اور اس اللہ واحد قہار کی حاکمیت تسلیم کرانی جائے جو فی الحقیقت



سرب الناس، ملک الناس اور الہ الناس ہے

لفظ "مسلمان" اگر کوئی بے معنی لفظ ہے اور محض علم کے طور پر انسانوں کے کسی گروہ کے لئے استعمال ہونے لگا ہے، تب تو مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ اپنی زندگی کے لیے جو مقصد چاہیں قرار دے لیں اور جن طریقوں پر چاہیں کام کریں۔ لیکن اگر یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کو بطور مسلک و مشرب قبول کیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کے لیے کوئی نظریہ، کوئی مقصد اور کوئی طریق کار اسلام کے نظریہ، مقصد اور طریق کار کے ہوا نہیں ہو سکتا۔ غیر اسلامی نظریہ اور پالیسی اختیار کرنے کے لیے حالات زمانہ اور مقتضیات وقت کا بہانہ کوئی بہانہ نہیں ہے۔ مسلمان جہاں جس ماحول میں بھی ہوں گے ان کو وقتی حوادث اور مقامی حالات و معاملات سے بہر حال سابقہ پیش ہی آئیگا۔ پھر وہ اسلام آخر کس کام کا اسلام ہے جس کا اتباع صرف مخصوص حالات ہی میں کیا جائے اور جب حالات دگرگوں ہوں تو اسے چھوڑ کر حسب سہولت کوئی دوسرا نظریہ اختیار کر لیا جائے؟ دراصل تمام مختلف حالات میں اسلام کے اساسی نظریہ اور بنیادی مقصد کے مطابق طرز عمل اختیار کرنا ہی مسلمان ہونا ہے۔ ورنہ اگر مسلمان ہر حادثہ اور ہر حال کو ایک جداگانہ نقطہ نظر سے دیکھنے لگیں اور ہمیشہ موقع و محل دیکھ کر ایک نئی پالیسی وضع کر لیا کریں جس کو اسلام کے نظریہ و مقصد سے کوئی لگاؤ نہ ہو، تو ایسے مسلمان ہونے میں اور نا مسلمان ہونے میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ایک مسلک کی پوری کے معنی ہی یہ ہیں کہ آپ جس حال میں بھی ہوں آپ کا نقطہ نظر اور طریق کار اس مسلک کے مطابق ہو جس کے آپ پیرو ہیں۔ ایک مسلمان سچا مسلمان اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ زندگی کے تمام جزئی معاملات اور وقتی حوادث میں اسلامی نقطہ نظر اور اسلامی طریقہ اختیار کرے۔ جو مسلمان کسی موقع و محل میں اسلامی پہلو چھوڑ کر غیر اسلامی پہلو اختیار کرتا ہے اور یہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس موقع اور اس محل میں تو مجھے غیر اسلامی طریقہ ہی پر کام کر لینے دو، بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو مسلمان بن کر کام کرنے لگوں گا، وہ دراصل یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو اسلام کو وہ بجائے خود کوئی ایسا ہمہ گیر نظام زندگی ہی نہیں سمجھتا جو زندگی کے ہر معاملہ



اور زمانہ کی ہر گردش پر یکساں حاوی ہو سکتا ہو، پھر اس کا ذہن اسلام کے سانچے میں پوری طرح نہیں ٹھہرا  
ہے جس کی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اسلام کے کلیات کو جزئی حوادث پر منطبق کر سکے اور یہ سمجھ  
سکے کہ مختلف احوال میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔

ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب میں دینا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہار مسرت کی کوئی  
وجہ نظر نہیں آتی کہ ٹرکی پر ترک، ایران پر ایرانی، اور افغانستان پر افغان حکمران ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت  
سے میں حکم الناس علی الناس للناس کے نظریہ کا قائل نہیں ہوں کہ مجھے اس پر مسرت ہو۔ میں اس کے  
برعکس حکم اللہ علی الناس بالحق کا نظریہ رکھتا ہوں، اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر  
انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہل فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے، اسی قدر ٹرکی اور دوسرے ملکوں  
پر ان کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ غلط، اس لیے کہ جو قومیں اپنے آپ کو  
مسلمان کہتی ہیں ان کا خدا کی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوسناک  
ہے۔ غیر مسلم اگر ضالین کے حکم میں ہیں تو یہ مَغْضُوبٌ عَلَیْہُمْ کی تعریف میں آتے ہیں۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں  
مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے وہ یہ ہے کہ  
آپ کے اس "پاکستان" میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق  
عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ "پاکستان" ہو گا ورنہ بصورت دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان"  
ہو گا جیسا ملک کا وہ حصہ ہو گا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے۔ بلکہ خدا کی نگاہ میں  
یہ اس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مبغوض و ملعون ہو گا، کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ  
کام کریں گے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔ اگر میں اس بات پر خوش ہوں کہ ہمارا رام داس کے بجائے عبد اللہ خدا کی  
۱۔ Government of the people, by the people, for the people  
۲۔ Rulership of God on Man with justice



منصب پر بیٹھے گا تو یہ اسلام نہیں ہے بلکہ نرانیٹلزم ہے، اور یہ مسلم نیشنلزم بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی ملعون ہے جتنا ہندوستان فی نیشنلزم۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے یہ اب تک کی تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا؟ یہ کونسا ایسا بڑا مسئلہ ہے جس پر مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی غور و فکر میں اپنا وقت ضائع کرے؟ مسلمان کو تو صرف اس چیز سے بحث ہے کہ یہاں انسان حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے یا حکم اناس کے آگے۔ اگر حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے تب تو ہندوستان کو اور زیادہ وسیع کیجیے، ہمالیہ کی دیوار کو بھی پنج میں سے ہٹائیے اور سمندر کو بھی نظر انداز کر دیجیے تاکہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ سب ہندوستان میں شامل ہو سکیں۔ اور اگر یہ حکم اناس کے آگے جھکتا ہے تو جہنم میں جائے ہندوستان اور اس کی خاک کا پرستار مجھے اس سے کیا دلچسپی کہ ایک ملک رہے یا دس ہزار ٹکڑوں میں بٹ جائے۔ اس بُت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرہ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔

مسلمان کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ انگریز کی حاکمیت سے نکلنا تو صرف کا لائن کا ہم معنی ہو گا۔ فیصلہ کا انحصار محض اس نفع پر نہیں ہے، اس پر ہے کہ اس کے بعد اثبات کس چیز کا ہو گا؟ اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اس لیے ہے — اور مجاہدین حریت میں سے کون صاحب یہ جھوٹ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ اس لیے نہیں ہے — کہ امپیریلزم کے الہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی کے الہ کو بُت خانہ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات لگا اور منات آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔



باطل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے؟ ان اللہ لایعجو  
السیئی بالسیی ولکن یجوالسیی بالحسن ان الخبیث لایعجو الخبیث۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقع  
اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کا سد نکلیں گی۔ خواہ مغربی  
تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین و مفتیان شرع مبین، دونوں قسم کے رہنما اپنے نظریہ  
اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے  
ہیں۔ دونوں اپنے اصلی ہدف کو چھوڑ کر ہوا میں چوبائی تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہتوسا  
ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپیریلزم کے جنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گروہ کے سر پر انگریز  
کا بھوت مسلط ہے اور وہ انگریزی امپیریلزم کے جال سے بچ نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی  
نظر نہیں، ورنہ یہ دیکھتے کہ اصلی شیطان نہ یہ ہے نہ وہ، اصلی شیطان غیر اللہ کی حاکمیت ہے۔ اس سے نجات نہ پائی  
تو کچھ نہ پایا۔ لڑتا ہے تو اس کو مٹانے کے لیے لڑو۔ جو تیر چلانا ہے اس ہدف کی طرف شست باندھ کر چلاؤ۔ جس  
قدر قوت صرف کرنی ہے اسے محو کرنے پر صرف کر دو۔ اس کے سوا جس کام میں بھی تم اپنی مساعی صرف کر دو گے وہ اسی  
طرح پر آگندہ اور انگاں ہو کر رہیں گی جس طرح ان لوگوں کی مساعی جن کے متعلق قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ قُلْ هَلْ  
نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا؟ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ  
يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔ أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَخَبُطُوا أَعْمَالَهُمْ فَلَا يُقِيمُونَ لَهُمْ  
يَوْمَ الْقِيَمَةِ وُزْنًا۔

مغربی طرز کے لیڈروں پر تو چنداں حیرت نہیں کہ ان بیچاروں کو قرآن کی ہوا تک نہیں لگی ہے، مگر حیرت

اس کی جگہ نے لے تو ناپاک کی مٹی کہاں ہے۔

اس کی جگہ نے لے تو ناپاک کی مٹی کہاں ہے۔







نہیں، اسی دنیا کے ہیں جس میں ہم رہتے ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام آئے ان میں سرے سے کوئی سیاسی، معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی۔ پس جب یہ واقعہ سے کہ اسلامی تحریک کے برسرِ طرے ہر ملک اور ہر زمانہ میں تمام وقتی اور مقامی مسائل کو نظر انداز کر کے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی پر اپنا سارا زور صرف کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ ام المسائل تھا اور وہ اسی کے حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے۔

اب یا تو یہ کہہ دیجیے کہ اسلامی تحریک کے وہ لیڈر جو خدا کی طرف سے آئے تھے، اب کے سب عملی سیاست سے نا بلد تھے، نہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے معاملات میں کونسی چیز مقدم اور کونسی موخر ہونی چاہیے، اور انھیں خبر نہ تھی کہ آزادی کے لیے جدوجہد کس طرح کی جاتی ہے اور ملکی معاملات کو حل کرنے کی کیا تدبیریں ہیں یا پھر یہ تسلیم کیجیے کہ اس دور میں جو حضرات اسلام کے نمائندے اور مسلمانوں کے قائد و رہنما بنے ہوئے ہیں وہ جزئیات شرع پر کتنا ہی عبور رکھتے ہوں، بہر حال اسلامی تحریک کے مزاج کو وہ نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے کہ اس تحریک کو چلانے اور آگے بڑھانے کا طریقہ کیا ہے۔

تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اس تحریک سے ہے جس کے لیڈر انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظام فکر اور ایک خاص طریق کار ہوتا ہے۔ اسلام کا نظام فکر اور طریق کار وہ ہے جو ہم کو انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں ہوں، اور ہمارے گرد و پیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے لیے مقصد و نصب العین وہی ہے جو انبیاء کا تھا، اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاء ہر زمانے میں چلتے رہے۔ اُوَیْلَکَ الَّذِیْنَ هَدٰی اللّٰهُ فَبِھُذِھِمْ قُتِبَہِمْ۔ ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے انھوں نے دیکھا۔ ہمارا معیارِ قدر وہی ہونا چاہیے جو ان کا تھا۔ اور ہماری چہل قدمی



پالیسی انہی خطوط پر قائم ہونی چاہیے جن پر انہوں نے قائم کی تھی۔ اس مسئلہ کو چھوڑ کر اگر ہم کسی دوسرے مسئلہ کا نظریہ اور طرز عمل اختیار کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے۔ یہ بات ہمارے مرتبے سے فز تر ہے کہ ہم اس تنگ زاویہ سے معاملات دینا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست، یا ایک وطن پرست، یا ایک جمہوریت پسند یا ایک اشتراک ان کو دیکھا ہے۔ جو چیزیں ان کے لیے بلند ترین منتہائے نظر ہیں وہ ہمارے لیے اتنی پست ہیں کہ ادنیٰ التفات کی بھی مستحق نہیں۔ اگر ہم ان کے سے ڈھنگ اختیار کریں گے، انہی کی زبان میں باتیں کریں گے، اور انہی گھٹیا درجہ کے مقاصد پر زور دیں گے جن پر وہ زلفیتہ ہیں تو اپنی وقعت کو ہم خود ہی خاک میں ملا دیں گے۔ شیر اگر بکری کی سی بولی بولنے لگے اور بزغالوں کی طرح گھاس پر ٹوٹ پڑے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی بادشاہی سے وہ آپ ہی دست بردار ہو گیا۔ اب وہ اس کی توقع کیسے کر سکتا ہے کہ جنگل کے لوگ اس کی وہ پوزیشن تسلیم کریں گے جو شیر کی ہونی چاہیے؟ یہ تعداد کی بنا پر قومی حکومت کے مطالبے، یہ اکثریت و اقلیت کے نوچے، یہ تحفظ اور حقوق کی چیخ پکار، یہ انگریزی سلطنت اور والیان ریاست کے ظلم و مظلومت میں قومی مفاد کے تحفظ کی تہمتیں اور دوسری طرف یہ آزادی وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے غمروں میں امیر ملزم کی مخالفت، یہ سب ہمارے لیے بکری کی بولیاں ہیں۔ یہ بولیاں بول کر ہم خود ایک غلط پوزیشن اختیار کرتے ہیں اور اپنی پوزیشن اس قدر غلط طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ دنیا ہمیں بکری ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ خدا نے ہمیں اس سے بہت اونچا منصب دیا ہے۔ ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم کھڑے ہو کر تمام دنیا سے یہ اللہ کی حاکمیت ملادیں اور خدا کے بندوں پر خدا کے ہوا کسی کی حاکمیت باقی نہ رہنے دیں۔ یہ شیر کا سا منصب ہے اور اس منصب کو ادا کرنے کے لیے کسی قسم کی خارجی شرائط درکار نہیں ہیں بلکہ صرف شیر کا دل درکار ہے۔ وہ شیر نہیں ہے جو اگر بکریوں میں بند ہو تو بکری کی طرح میاں لے لے، اور شیر وہ بھی نہیں جو بکریوں کی کثرت تعداد کو دیکھ کر یا بھڑبھڑوں کی چیرہ دستی دیکھ کر اپنی شیریت بھول جائے۔



# اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہ عمل

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام تمام عالم انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام ہے۔ اُس کا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہ لا شریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اس کے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے۔ اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ افسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتنا بنا کر اپنا پر ازور اس بنیادی اصلاح کو عملًا نافذ کرنے میں صرف کر دیں، یہاں تک کہ اشخاص کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرماں برداری اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اس کی رحمت پر صرف اُسی کا قانون عملاً جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتداء سے لے کر آئے رہے ہیں۔ اسی ایک مقصد پر انھوں نے اپنی تمام سعی و جہد کو مرکوز کیا ہے۔ اور مسلمان جو انبیاء کے وارث اور ان کے پیرو ہیں، ان کے لیے بھی اس کے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انھوں نے اس نصب العین اور اس راہ عمل کو چھوڑ کر ایسے مفاد و طریقے اختیار کر لیے ہیں جن کو اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے پرہ ہیں، آج تک مجھے کوئی مسلمان، خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے اس اعتراض کو سن کر معمولی تہنیت سے تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلاشبہ مسلمان کا اصلی کام یہی ہے اور اسی منزل کی طرف انبیاء علیہم السلام نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ لیکن جواب میں دو مختلف مہمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں:



”آزادی پسند علماء اور اُن کے بحیال مسلمان اس راستہ پر آنے کی مستکملات یوں بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی، جیسی مصر، ایران، عراق وغیرہ ممالک میں ہے، تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومت الہیہ کے لیے جدوجہد کرتے، اور اس صورت میں اس کے قائم ہونے کا امکان بھی تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل اقلیت ہیں۔ اکثریت غیر مسلم ہے۔ حکومت الہیہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے، اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک اس کی نظر جاسکتی ہے۔ اور انگریزی حکومت بھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو ایک ساتھ دبانے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا اکثر حصہ بھی خلافتی و اعتقادی حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہذا اس وقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر، انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کرنی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو پھر مجتمع کریں گے اور اپنے نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ اس وقت قابل عمل نہیں ہے۔“

دوسری طرف مسلم لیگ اور اس کے ہم خیالوں کو اپنی مستکملات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اول تو قلیل اقلیت ہیں، پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے، اور مزید برآں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے مطابق پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے بیروں اسے سے دور بٹاتی ہے، مگر سیاسی اغراض کے لیے اس وقت ہمارے مستقبل قوی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہم ہندوستانی قوم میں شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہونے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو۔ اس مقصد میں اس کے کاہل بے جا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھو دیں، پھر ہندو حکومت الہیہ کا خواب کہاں دیکھا جائے گا۔ لہذا سر درست اس کے ہوا کوئی قابل عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دہاکا اور سب قومیں اپنی تنظیم لیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح یہ اسی راہی لڑائی جاتی ہے اسی طرح



ہم بھی رٹا کر سب سے پہلے ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی قسوں جمہوریت کے تحت بننا ہے، اپنی حکومت قائم کر لیں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ہاتھ میں آجائیں گے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اخلاقی و تمدنی حالت کو درست کر کے رفتہ رفتہ حکومت جمہوریہ کو حکومت الہیہ میں تبدیل کر لیں گے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہیں گے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ خود یہی بات کہ حکومت الہیہ کے راستہ میں انھیں اس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انھوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریق کار (Technique) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو باہمی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔

دینا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال، وہاں سرے سے کوئی مسلمان قوم موجود ہی نہ تھی۔ ایک فی قوم بلکہ ایک فی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعویٰ لے کر اٹھتا ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اس کے ساتھ ہو جلتے ہیں اور یہ آٹے میں نمک سے بھی کم اقلیت، حکومت الہیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اکثریت کا مندر اس کے ساتھ جو کچھ سلوک کرتا ہے، اس کے مقابلے میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اس تہر و تسلط کی سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جس کا نوہ کرتے کرتے ہمارے مسلم قوم پرست "بھائیوں" کے آنسو خشک ہوئے جارہے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے معاملات کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اقلیت کو نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر حکومت، خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس بچہ ظلم و شکنجہ تہر میں ان کو گستی تھی، اس کو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے ان انگریز فرماں رواؤں کے برتاؤ سے تمثیل نہیں دی جاسکتی جن کے ظلم و جور کارونا ہمارے آزادی پسند بھائی



رات دن رو دیا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ پہر حال رسول اور اصحاب رسول حکومت الہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بارہا وہ اس مقصد میں ناکام ہوئے ہیں، ان کو اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدائی کے چھوٹے مدعیوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا قلع قمع کر کے چھوڑا ہے۔ مگر اس کے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تھے، اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس ہی تھا، انھوں نے آخری سانس تک ہی مقصد کے بے کام کیا، اور کسی ایک نے بھی اشریت لایا حکومت کا رنگ دیکھ کر، یا واقعی و مقامی مشکلات کا خیال کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔ پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے جس سامان اور جس سازگار ماحول کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے، نہ فراہم ہو گا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے، اس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اعدا اس غم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لیے ہے یہ ایمان، یہ شہادت، یہ غم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان کرنے کے لیے کافی ہے کہ جہاد میں پر خدا کی پادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومت خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی قطعاً کوئی حاجت نہیں۔ نہ اس امر ہی کی کوئی حاجت ہے کہ اس کا ملک پہلے بیرونی قوم کے تسلط سے آزاد ہو جائے۔ بیرونی قوم کیا، اور ظہر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی ممانعت تسلیم کرنے والے عرب انسان اس کے لیے یں میں سب کی سب سے اور اس کی سب سے یکساں لڑائی ہے۔ مسیحیت رومیوں نے جو کچھ بڑا دیکھا، اس سے زیادہ ہولناک بڑا دیکھا جو ابراہیم سے ان کی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو مادی النظر میں ہر شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے۔ لیکن دراز بارہ

گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پاتے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں تو بلاشبہ اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ان سوالات میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ کس



ملک میں وہ آباد ہے وہاں اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا نہیں؟ اس کی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اس کی  
حاشی حالت کیسی ہے؟ اس کے اوپر ایک پتھر کا بوجھ ہے یا دو پتھر کا؟ انہی سوالات کے جوابات پر اس کا مستقبل منحصر  
ہوتا ہے، اور انہی سوالات کے لحاظ سے اس کو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک اصولی تحریک جو کسی خاص قوم  
کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صوبہ و نواح کے لیے ایک دعوت لے کر اٹھے، اس کے سامنے ان  
سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اس کے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اس کی کامیابی و  
ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اصول بجاے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں  
تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم فطرت انسانی کو کس حد تک پیل کرتے ہیں؟ اور اس کی طرف دعوت دینے والے خود اس  
کی پیروی میں کتنے مخصوص اور کتنے صادق العزم ہیں؟

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آ رہی ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان کے سوچنے والے دعاغلوں نے اپنی  
حیثیت کو ان دو مختلف حیثیتوں کے درمیان خلط ملط کر دیا ہے۔ کبھی تو یہ ان عزائم اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جن کا  
تعلق اسلامی تحریک سے ہے، اور ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو اور داعی  
ہیں۔ اور کبھی یہ محض ایک قوم بن کر رہ جاتے ہیں، اس طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح توہین سمجھتی ہیں، ایسے مسائل میں کچھ  
جانتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور اپنے اس طرز فکر کی وجہ سے ان مشکلات کو سدا رہ پاتے ہیں جو  
محض قومی منافصہ ہی کے لیے سدا رہ ہو کر رہتی ہیں۔ ان لوگوں نے آج تک ان دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا،  
نہ واضح طور پر فیصلہ کیا کہ دراصل یہ میں کیا۔ اسی لیے یہ کوئی ایسی پالیسی بھی تکاپے نہیں کر سکے جو تناقض سے مبرا  
اور الجھاؤ سے پاک ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابل تہنیت چیز نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنیت، اطالویت،  
انگریزیت، یا ہندویت کے متعلق کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان کی طرف دوسروں کو دعوت دی جاسکتی ہے۔  
یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے نہیں پیش کیا جاسکے۔ یہ تو نسل، نژاد اور تمدن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے



ہیں۔ ان دائروں کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہو سکتی ہے انہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جو ان دائروں کے اندر پیدا ہوئے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو ان سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو لامحالہ وہ جرمنوں ہی سے ہمدردی و اعانت کی توقع کر سکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ جرمنیت کی زندگی یا اس کی برتری کے معاملہ میں اس کا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی ٹرپ تو صرف جرمنوں ہی میں پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ ان کے مقابلہ میں انگریز بھی متحد ہو کر اپنا بول بالا کرتے یا رکھنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بعض افراد کو ناجائز ذرائع سے خرید کر اپنا آلہ کار بنالیں۔ مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لا کر جرمنوں کا ولی حمیم بن جائے یا جرمن انگریزیت اختیار کر کے انگریزوں کا حامی و ناصر بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دو قوموں کے درمیان موافقت ہوتی ہے وہاں محض خود غرضی کی موافقت ہو کر رہتی ہے اور صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک خود غرضی اس کی مقتضی ہو۔ اور جہاں ان کے درمیان کشمکش و مزاحمت ہوتی ہے وہاں دونوں کو صرف اپنی قومی طاقت، اپنی تنظیم، اپنے معاشی وسائل، اپنی تعداد اور اپنے آلات جنگ ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے جو قوم کمزور ہو وہ پس جاتی ہے اور جو طاقت ور ہو وہ اُسے پیس ڈالتی ہے۔ جرمنی کے مقابلہ میں پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کیوں مغلوب ہو گئے؟ فن لینڈ اور رومانیہ کو روس اور جرمنی سے کیوں دبنا پڑا؟ اسی لیے کہ مقابلہ ایک قوم اور دوسری قوم کا تھا۔ دونوں طرف قومیتیں تھیں۔ لہذا جس کی قومیت تعداد اور آلات و وسائل اور تنظیم میں بڑھی ہوئی تھی اُس نے کمزور کو دبا لیا۔ کوئی فریق بھی خالص انسانیت کی بنیاد پر ایسے اصول لے کر نہ اٹھا تھا کہ مخالف فریق کے انسانوں کو پس کرنا اور یہ ممکن ہونا کہ خود دشمنوں میں سے اس کو دوست بننے چلے جاتے۔

یہ ہوتی ہے ایک قوم کی حیثیت۔ اب غور کیجیے کہ فی الحقیقت کیا مسلمانوں کی حیثیت اس دنیا میں یا اس ہندوستان میں ہے؟ کیا ہم محض نسل، تاریخ اور موروثی تمدن کا بنایا ہوا ایک ایسا گروہ (Group) ہیں جس کی قومیت دنیا کی تمام قومیتوں کی طرح ناقابل تبلیغ ہو گیا ہو؟ کیا ہمارے مقاصد کی نوعیت بھی انہی قومی اغراض و مقاصد



کی سی ہے جن پر دوسری قوموں کا ایمان لانا فطرۃ غیر ممکن ہوتا ہے؛ کیا ہمارے مقاصد اسی قسم کے قومی مقاصد ہیں جن کا حصول صرف ایک قوم کی تعداد، تنظیم اور وسائل ہی پر موقوف ہوتا ہے؛ کیا وہ اسلامی حکومت جس کا ہم نام لیا کرتے ہیں محض ایک قومی ریاست (National State) ہے جس کے قیام کی بنیاد ایک قوم کی کثرت تعداد ہو کر تھی ہے؛ کیا قلیل التعداد ہونے کی صورت میں ہماری حیثیت واقعی ایک قومی اقلیت (National Minority) کی رہ جاتی ہے جس کے لیے اکثریت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے یا اپنی انفرادیت تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا؛ کیا حقیقت میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ غیر قوم کی حکومت نجات حاصل ہو جائے؛ اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہل وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے؟

مسئلہ اختیار کی جب یہ درجہ اس مسئلہ کے ساتھ ملتا ہے تو بلاشبہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اس وقت کر رہی ہیں۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد بھی صحیح، برطانوی حکومت اور دیسی ریاستوں کا ہمارے کر ہندو امپیریلزم کا مقابلہ بھی صحیح، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کا جھگڑا بھی صحیح، مسلم ریاستوں کی حمایت بھی صحیح، تقسیم ملک کا مطالبہ بھی صحیح، خاکساروں کی فوجی تنظیم بھی صحیح، اور وہ مسلم قوم پرستی بھی صحیح جس کی بنیاد حق اور اصول سے قطع نظر کر کے ہر اس فائدے کو دانتوں سے پکڑا جاتا ہے جو مسلمان قوم یا مسلمان اشخاص کو حاصل ہوتا ہو۔ غرض یہ سب کچھ صحیح ہے کیونکہ قومیت کا آئین یہی ہے، تو میں یونہی کام کیا کرتی ہیں، اور ایک قوم جو کسی اصول کی علمبردار نہیں بلکہ محض اپنی قومی بہتری کی خواہش مند ہو، ان تدابیر کے سوا آخر اور کیا تدبیریں اختیار کر سکتی ہے؛ البتہ ان سب چیزوں کے ساتھ اگر کوئی بات غیر صحیح ہے تو وہ ہماری یہ خوش فہمی کہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی ہم اس زمین پر حکومت الہیہ قائم کر سکیں گے، حالانکہ اس حیثیت میں یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھا جانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف ایک ایسی اصولی تحریک ہی میں ہے جو انسان کو بحیثیت انسان خطاب کرتی ہو اور اس کے سامنے خود اس کی اپنی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔



قومیت کے برعکس ایسی تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے۔ قومیت کے حصار، نسلوں کے تعصبات، قومی ریاستوں کے مضبوط بند، کوئی چیز بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر طرف، ہر جگہ نفوذ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کی طاقت کا انحصار اپنے پیروؤں کی تعداد یا ان کے وسائل پر نہیں ہوتا۔ ایک اکیلا آدمی اس کو اٹھانے کے لیے کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنے اصولوں کی طاقت سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کرتی ہے۔ سب قوموں میں سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے جھنڈے کے نیچے آنے لگتے ہیں اور وسائل اپنے ساتھ لاتے ہیں جو فوجیں اس سے لڑنے آتی ہیں ان پر وہ صرف اپنی توپ تفنگ سے ہی آتش باری نہیں کرتی بلکہ اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کے تیر بھی چلاتی ہے۔ خون کے پیاسے دشمنوں میں سے وہ اپنے سرگرم حامی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ سپاہی، جنرل، ماہرین فنون، سرمایہ دار، صنایع اور کارگیر سب انہی میں سے اس کو مل جاتے ہیں اور بے سروسامانی میں سے ہر قسم کا سامان نکلتا چلا آتا ہے۔ قومیتیں اس کے سیلاب کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھیر سکتیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اس کے سامنے آتے ہیں اور نمک کی طرح پھل پھل اس آب رواں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے اقلیت اور اکثریت کے سارے سوالات بے معنی ہیں۔ وہ اس کی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ کسی منظم اور با وسیلہ قوم کی طاقت اس کی پشت پر ہو۔ وہ قومی حکومت قائم کرنے نہیں اٹھتی کہ قومیں اس کی مزاحمت کر سکیں۔ اسے تو ایک ایسے اصول کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے جو سب قوموں کے لوگوں کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ جاہلی تعصبات کچھ دیر تک اس سے لڑتے رہتے ہیں، مگر جب فطرت انسانی پر لگا ہوا رنگ چھوٹتا ہے تو وہ کیفیت ہوتی ہے کہ

ہمہ آہوان صحرا میں خود ہنار دہ رکھ      بائید آنکہ رور سے بہ شکار خواہی آمد

مسلمان قرآن اور سیرت رسول کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں جس چیز کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں کہیں وہ اسی نوعیت کی تحریک تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ قوموں کے درمیان رہتے رہتے اور اپنی حسی تعلیم و تربیت پاکر اپنی اصلی حیثیت بھول گئے ہوں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو قوم کہنے لگتے رہیں وہ سب محدود بین بھی انھوں نے اپنے خیال میں خود اپنے اوپر عائد کر لی ہوں جو ایک قلیل وسائل قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں



اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصل حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیروں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ پوری صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیت العلماء اور آزاد کا نفرنس، سب کی اس وقت تک کی تمام کار و دایاں حرف باطل کی طرح محو کر دینے کے لائق ٹھہرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فی صدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ ان ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں، نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے، نہ اکثریت کی بنیاد پر ہمیں قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں، بندوں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اس قانون عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیان ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان سب کے سامنے پیش کریں گے جو اسے قبول کرے گا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس سے انکار کرے گا اس سے ہماری لڑائی ہے بلالٰہی ظا اس کے کہ اس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔

یہ حیثیت اختیار کرنے اور اس تحریک کو لے کر اٹھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے شخصی اور قومی مفاد و اغراض کو بھول جائیں، تمام تعصبات سے بالاتر ہو جائیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹالیں جن سے ہمارے حقیر ذمیوی فوائد کا تعلق ہے۔ اگر ہم میں ہندو تائیت کا تعصب ہو گا تو فطری بات ہے کہ انگریز اور ہر غیر ہندوستانی کے کان ہماری دعوت کے لیے بہر ہو جائیں۔ اگر ہم نام نہاد مسلم قومیت کے تعصب میں مبتلا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو یا سکھ یا عیسائی کے دل کا دروازہ ہماری پکار کے لیے کھل جائے۔ اگر ہم حیدر آباد، بھوپال، بہاول پور اور راجپوت جیسی ریاستوں کی حمایت جنس اس لیے کریں کہ ان کے رئیس مسلمان ہیں اور ان سے مسلمانوں کو کچھ معاشی بہا ر اہل جاتا ہے، تو کوئی جتن ہی ہو گا جو اس کے بعد بھی یہ باور کرے گا کہ ہم اسلام کے نظریہ سیاسی پر ایمان رکھتے ہیں اور واقعی حکومت الٰہی قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ اگر ہم غیر مسلم حکومت کی ملازمت اور غیر اسلامی جمہوری ادارات میں مسلمانوں کی



نمائندگی پر چھوڑ کر اس آواز میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا کہ ہم اصول اسلام کی فرماں روائی قائم کرے  
اٹھے ہیں۔ اگر ہم تناسب آبادی کے لحاظ سے تقسیم ملک کا مطالبہ کریں تو غیر مسلموں کو ہم میں اور خود اپنے آپ میں سرے  
سے کوئی فرق ہی محسوس نہ ہوگا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر ہماری دعوت پر لبیک کہنے کی کوئی ضرورت سمجھیں۔ اگر ہم غیر اسلامی  
اصول پر مشترک وطنی حکومت قائم کرنے میں حصہ لیں تو ہمارے اس فعل میں اور ہماری اس دعوت میں ایسا فرق تناقض  
ہوگا کہ ہماری صداقت کیا معنی، صحتِ عقل تک مشتبہ ہو کر رہ جائے گی۔ اس راستہ پر چلنے کے بیٹے ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا  
ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ہمیں بہت نقصانات پہنچیں گے، مگر ایسے نقصانات اٹھائے بغیر اسلامی تحریک نہ کبھی چلی ہے  
زچل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ یہ دنیا میسج کے قول کے مطابق جیتہ جاتا ہے تو کڑتا بھی چھوڑنے کے لیے  
تیار ہو جاؤ۔ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکے گی۔



# اسلام کی راہِ راست اور اسے انحراف کی راہیں

مسلمانوں میں سے جو لوگ پاکستان کے نصب العین پر اپنی نظر جمائے ہوئے ہیں، اور جو انگریزی حکومت سر ہندوستان کی آزادی پر اپنی آنندہ کی تمام امیدوں کا انحصار رکھتے ہیں، اور جو ان دونوں کے درمیان مختلف راہیں تلاش کر رہے ہیں، ان سب کے اندر ایک چیز مجھے مشترک نظر آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے یہ سب لوگ جھجکتے ہیں، مشکلات کا ایک بہت بڑا پہاڑ ان کو اس راستہ میں حائل نظر آتا ہے اور اس کو دُور سے دیکھ کر یہ دایمیں بائیں جانب مڑ جاتے ہیں تاکہ پھیر کے راستوں سے نکل جائیں۔ حالانکہ میں علیٰ وجہ بصیرت یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی نصب العین تک کسی پھیر کے راستہ سے پہنچنا غیر ممکن ہے۔ اس کی طرف اگر پیش قدمی کی جاسکتی ہے تو براہِ راست ہی کی جاسکتی ہے، اور جو مشکلات اس راستہ میں نظر آتی ہیں وہ ناقابلِ عبور نہیں ہیں بشرطیکہ ان کو صریح طور سے سمجھنے اور دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اوپر کے فقرے میں جو محفل دعویٰ میں نے کیا ہے اب میں اس کا تجزیہ کر کے ایک ایک جز پر الگ الگ بحث

کروں گا۔

۱۔ اصل اسلامی نصب العین کیا ہے ؟

۲۔ اس کی طرف پیش قدمی کا سیدھا راستہ کونسا ہے ؟

۳۔ اس راستہ میں جو مشکلات نظر آتی ہیں وہ کیا ہیں ؟

۴۔ ان مشکلات کو دیکھ کر پھیر کے راستے کون کون سے اختیار کیے جا رہے ہیں ؟

۵۔ ان مختلف راستوں میں غلطی کیا ہے اور یہ اصل مقصود تک کیوں نہیں پہنچا سکتے ؟



۶۔ مشکلات کی حقیقی نوعیت کیا ہے اور وہ کس طرح دور ہو سکتی ہیں ؟

یہ سوالات ہیں جن پر مجھے اس مضمون میں مختصر بحث کرنی ہے۔

## ۱۔ اسلامی نصب العین

پہلے سوال کا جواب قرآن مجید میں جو کچھ دیا گیا ہے وہ یہ ہے :

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلَىٰ الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ

كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔

”وہی ہے (یعنی اللہ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اس کو پوری صی دین پر غالب کر دے خواہ

یہ کام مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔“

اس آیت میں اَلْهُدَىٰ (ہدایت) سے مراد دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ انفرادی برتاؤ، خاندانی نظام، سوسائٹی کی ترکیب، معاشی معاملات، ملکی انتظام، سیاسی حکمت عملی، بین الاقوامی تعلقات، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسانی زندگی کے لیے صحیح رویہ کیا ہونا چاہیے، یہ چیز اللہ نے اپنے رسول کو بتا کر بھیجا ہے۔

دوسری چیز جو اللہ کا رسول نے کر آیا ہے وہ دین حق ہے۔ دین کے معنی اطاعت کے ہیں کیش اور مذہب کے لیے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے یہ اس کا اصل معنی موضوع نہ نہیں ہے بلکہ اس کو دین اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس

میں بھی انسان خیال محل کے ایک خاص سسٹم کی اطاعت کرتا ہے۔ دراصل دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانہ حال میں ”سیسٹم“ کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کرنا، یہ ”سیسٹم“ ہی

ہی ”دین“ کا مفہوم بھی ہے۔ اور ”دین حق“ یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی زندگی

دلچسپ کرے اور اللہ سے اقتدار بھی تسلیم کرے اور اسی کی بندگی و اطاعت کرے پس حقیقت اللہ کا یہی وہی ہے جو ایک ”سیسٹم“ کا نظام

کے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام،



بلکہ حاکمیت و اقتدار اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے ہے۔

پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس نظام اطاعت (دین) اور اس قانون حیات (الہدیٰ) کو پوری جنس دین پر غالب کر دے۔ پوری جنس دین سے کیا مراد ہے؟ دنیا میں انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر جن جن صورتوں سے کسی کی اطاعت کر رہا ہے وہ سب جنس دین کی مختلف انواع ہیں۔ بیٹے کا والدین کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا، ماتحت کا افسر کی اطاعت کرنا، رعیت کا حکومت کی اطاعت کرنا، پیروں کا پیشواؤں اور لیڈروں کی اطاعت کرنا، یہ اور ایسی ہی دوسری بے شمار اطاعتیں بحیثیت مجموعی ایک نظام اطاعت بنائی ہیں اور اللہ کی طرف سے رسول کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پورا نظام اطاعت اپنے تمام اجزاء سمیت ایک بڑی اطاعت اور ایک بڑے قانون کے ماتحت ہو جائے، تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں، ان سب کو منضبط (Regulate) کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو، اور اس بڑی اطاعت اور اس ضابطہ قانون کی حدود سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ رہے۔

یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے، خواہ شرک کرنے والے اس پر کتنی ہی ناک بھول چڑھائیں، شرک کرنے والے کون ہیں؟ وہ سب لوگ جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات (یعنی خدا کی اطاعت سے آزاد) اطاعتیں شریک کرتے ہیں۔ جہاں تک اللہ کے قانون طبعی (Law of Nature) کا تعلق ہے، ہر انسان طوعاً و کرہاً اس کی اطاعت کر رہا ہے کیونکہ اس اطاعت کے بغیر تو اس کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انسان کے دائرہ اختیار کا تعلق ہے، اس دائرے میں بعض انسان تو بالکل ہی غیر اللہ کے مطیع بن جاتے ہیں اور بعض انسان اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے کسی حصہ میں خدا کے بھیجے ہوئے قانون اخلاقی (شرعی) کی اطاعت نہیں کرتے، دوسرے حصہ میں نفس یا دھروں کی اطاعت بجالاتے ہیں۔ اسی چیز کا نام اللہ کی اطاعت نام دوسری اطاعتوں شریک کرنا ہے، اور جو لوگ شرک کی ان مختلف صورتوں میں مبتلا ہیں، ان کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے کہ اپنی فطری اطاعت کی طرح اپنی اختیاری اطاعت و بندگی کو بھی بالکل اللہ کے لیے خالص کر دیں۔ خواہ نادانی کے سبب یا اخلاقی کمزوری



کے سبب، بہر حال وہ شرک پر اصرار کرتے ہیں، لیکن اللہ کے رسول پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی فرہمت کے باوجود اپنے مشن کو پورا کرنے۔

## ۲۔ اسلامی نصب العین تک پہنچنے کا سیدھا راستہ

یہ ہے اسلامی نصب العین، اور اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے راہ راست ہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو اہدئی اور دین حق کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، اور وہی اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ کر لیں، اور اللہ کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنالیں، ان کا ایک مضبوط جھانسا یا بسائے۔ پھر یہ جھانسا تمام ان اخلاقی، علمی اور مادی فرائض سے جو اس کے اسکان میں ہوں، دین حق کو قائم کرے کہ یہ جہاد کبیر کہے یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بل پر قائم ہیں ان سب کو زور ٹوٹ جائے اور پورے نظام اطاعت پر وہی اہدئی اور دین حق غالب آجائے۔

### اس راہ راست کا ہر حق قابلِ غور ہے،

بہرہ اجزیہ ہے کہ ان قانون کو بالعموم اللہ کی حاکمیت اقتدار الہی تسلیم کرنے اور اس کے خبیث ہونے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ یہ دعوت عام ہوتی چاہیے۔ یہ وقت باری رہنی چاہیے۔ اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق باتوں کی اہمیت نہ ہونی چاہیے۔ قوموں، نسلوں اور ملکوں کے ماحمی جھگڑے، خود اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی تحسین غیر الہی نشانات ہیں۔ سب ایک دوسرے پر ترجیح دینا، یا کسی ایسے نظام واسطہ کی توثیق و تائید کرنا، یا کسی نظام فاسد میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنا، یا سب چیزیں نہ صرف یہ کہ اہدئی اور دین حق کے ساتھ میل نہیں کرتیں، بلکہ سب سے بڑی اور اس کے منافی اور اس کے لیے مفرت رساں ہیں، پس جب کسی شخص یا گروہ کو دعوت حق کی فہمیت اور تمام حقائق اور کجیوں سے الگ ہو جانا چاہیے اور اپنی دعوت کے ساتھ



کسی دوسرے غیر متعلق اور بے جوڑ قصبے کو شامل نہ کرنا چاہیے۔

دوسرا جز یہ ہے کہ حقیقتاً صرف اُن لوگوں کا بنایا جائے جو اس عرصہ کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں۔ جو دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ واقعی ٹریک کرنا چھوڑ دیں اور حقیقت میں اللہ کے قانون کو اپنا قانون زندگی بنالیں۔ رہے دوسرے لوگ جو اس طرز خیال یا اس طرز زندگی کے محض معترف ہوں، یا اس سے ہمدردی رکھتے ہوں، تو وہ مجاہدہ کرنے والے جتنوں کے ریڈر کیا مسمیٰ، کارکن بھی نہیں بن سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو جس درجہ میں بھی اس کا ہمدرد یا پیرو فی مساوان بن جائے بسا اذیت ہے، مگر کان اور ہمدردی کے درمیان جو حقیقی فرق و امتیاز ہے اسے کسی حال میں بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

تیسرا جز یہ ہے کہ براہ راست غیر الہی نظام اطاعت پر حملہ کرنا جائے۔ تمام کوششوں کا مقصد صرف اس ایک بات کو بنایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو، اور اس کے سوا کسی دوسری چیز کو مقصد و بنا کر اس کے پیچھے تو تین ضارح نہ کی جائیں۔

### ۳۔ مشکلات

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی مستقل سیاسی جماعتیں ہیں، قریب قریب اُن سب کا دعویٰ یہی ہے کہ ہمارا نصب العین اسلامی نصب العین ہی ہے۔ مگر ان سب نے اُس راستہ کو چھوڑ دیا ہے جس کی تشریح ابھی میں نے بیان کی ہے۔ وہ نہ تو "اہل حق" اور "دین حق" کی خالص، بے آمیز دعوت عام دیتی ہیں۔ نہ اُس پارٹی کی تشکیل کرتی ہیں جس کی قیادت و کنیت صرف اُن لوگوں تک محدود ہو جو واقعی اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے حاس کرتے ہوں۔ اور نہ وہ غیر متعلق مقصد کو چھوڑ کر صرف اس ایک مقصد کو اپنی کوششوں کا بدت بناتی ہیں جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ راہ راست کے ان تینوں اجزاء سے یہ سب جماعتیں منحرف ہو گئی ہیں۔

اس انحراف نے مختلف جماعتوں کے مسلک میں کیا کیا عورتیں اختیار کی ہیں، اس کی تفصیل میں بعد میں بیان کر دیں گے۔ پہلے میں اس انحراف کا سبب بتا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اس اسلامی نصب العین کی طرف براہ راست پیش قدمی کرنے میں تین بڑی مشکلات نظر آتی ہیں جن کا کوئی حل ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔



(۱) رہے پہلی شکلِ جہان کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ الہدیٰ اور دینِ حق کی طرف دعوتِ عام کا نتیجہ خیز اور کامیاب ہو یا موجودہ حالات میں ان کو محال نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسری تحریکیں تو محض سیاسی تہذیبی اور معاشی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں اور جن لوگوں کو ان کا نتیجہ نہ دیکھ سکیں وہ اکیلے کرتا ہے وہ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کیے بغیر ان کے مسائل میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام محض دنیوی مسائل کا حل پیش نہیں کرتا بلکہ عفاۃً کا ایک نظام اور عبادات اور قوانین شرعیہ کا ایک ضابطہ بھی پیش کرتا ہے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ لوگ اپنا مذہب و اپنی قومیت تبدیل کر دیں۔ پھر یہ کیسے امیر کی جاسکتی ہے کہ اسلام کی دعوتِ عام اس طرح چیلنگ کے گئی جس طرح دوسری تحریکیں کھینچتی ہیں۔

(۲) دوسری شکل جو اس راستہ میں انہیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف لوگوں میں شدید تعصبات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دوسری تحریکوں کا پھیلنا انسان ہے کیونکہ ان کے خلاف تعصبات موجود نہیں ہیں، مگر اسلام پھیلنا مشکل ہے کیونکہ اس کا نام سنتے ہی مانع اور حال کے تعصبات کا ایک طوفان اٹھ جاتا ہے۔

(۳) تیسری شکل ان کی نگاہ میں یہ ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی ایک قوم یہاں موجود ہے جو قومیت کے اعتبار سے تو مسلمان ہے، مگر اس کا اندازِ مزاج تنہا نہیں ہے۔ وہ اسلامی اندازِ فکر کے لیے جدوجہد کر سکے۔ اس قوم کو لے کر اس ناخوشہ پروانا چاہیں تو چیلنگ نہیں دے سکتے اس کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے قومیتوں میں چاہتا۔ اور پھر یہ سوال بھی دماغ کو پریشان کرتا ہے کہ اگر نام مقاصد کو نظر انداز کر کے صرف ایک قومیت الہی کے مقصد پر توجہ دے اور اردنی جائیں تو آخر موجودہ سیاسی حالات کو آئندہ کے دستور میں بغیر ان مسلمانوں کے قومی مفاد کو کیسے حل ہو گا۔

## بہ انحراف کی راہیں

یہی تین شکایات ہیں جن کو اس راہ میں جان دیکھ کر لوگ دائیں اور بائیں رخ پر راستہ کرتے ہیں اگر ان کے گوشش کرستے ہیں۔ انحراف کے احباب سے مختلف وکون کے نظریات و عملی طریقوں میں اختلافات ہیں ان کو نظر انداز کر کے بڑی اور چھوٹی تقسیم کر لی جاسکتی ہے تو یہ رہنما ہیں کہ وہ ان میں فرقہ وارانہ ہیں۔

ایک وہ گروہ جو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں مگر ہم اپنی قومیت کو نفرت کر کے اس ملک کو انگریزوں کے



سے آزاد کرالینا چاہیے تاکہ پہلے ایک مشترک جمہوری سٹیٹ قائم ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم بتدریج اس سٹیٹ کو اسلامی سٹیٹ میں تبدیل کرنے کے لیے کوشش کریں گے۔

دوسرا وہ گروہ جس کا خیال ہے کہ پہلے انگریزی اقتدار کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہمیں مستقل ہندو اکثریت کے تسلط کا سدباب کرنا چاہیے۔ اور اسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس ملک میں ایک جمہوری سٹیٹ کے بجائے دو سٹیٹ قائم ہوں، ایک وہ سٹیٹ جس میں مسلم اکثریت کی وجہ سے اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے دوسرا وہ سٹیٹ جس میں ہندو اکثریت کی وجہ سے اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں جائے مگر زیادہ سے زیادہ جو آئینی تحفظات ممکن ہیں ان کے ذریعہ مسلمانوں کی پوزیشن محفوظ ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم مسلم اکثریت والے سٹیٹ کو بتدریج اسلامی سٹیٹ میں تبدیل کر لیں گے اور پھر ہندو اکثریت والے سٹیٹ میں تغیر و اصلاح کی کوشش کریں گے۔

تیسرا وہ گروہ جو موجودہ حالات میں دعوت عام اور ایک انقلابی پارٹی کی تشکیل کو اسان بنانے کے لیے اسلام کو ایک دوسرے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کے لیے قابل قبول ہو جائے جو اسلامی عقائد اور عبادات اور نظام شریعت کی بندشوں سے گھبراتے ہیں۔ اس گروہ نے اگرچہ ابھی کوئی مستقل جماعتی صورت اختیار نہیں کی ہے، مگر مجھے معلوم ہے کہ اس طرز خیال کے لوگ ایک اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں اور ان کی تجویزیں اس وقت حالت جنینی سے گزر رہی ہیں۔

## ۵۔ منحرف راستوں کی فطرت

اب میں ان میں سے ایک ایک گروہ کے طریقہ پرانگ الگ ترقیہ کے بتاؤں گا کہ ان طریقوں میں غلطی کیا ہے ان میں سے ہر ایک نے اسلام کی راہ راست سے کس طرح انحراف کیا ہے، اور ان پھیر کے راستوں سے اصلی اسلامی تعلیمات تک پہنچنا ابنا غیر ممکن الوقوع کیوں ہے۔

آزادی ہند کو مقدم رکھنے والے | پہلا گروہ زیادہ تر علماء اور مذہبی خیالات کے لوگوں پر مشتمل ہے اور بالعموم اس گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کی نسبت زیادہ مذہبی ہیں۔ وجہ سے ان کے انحراف پر مجھ کو سب سے زیادہ افسوس ہے۔



ان حضرات نے مذکورہ باز آشفتگی سے خوفزدہ ہو کر یہ خیال قائم کر لیا کہ موجودہ حالات میں اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہ راست پیش قدمی نہیں کی جاسکتی، اس لیے انھوں نے اپنی کوششوں کا مقصد یہ ٹھہرایا کہ ہندوستان انگریزی اقتدار سے آزاد ہو جائے۔ مقصود بدل جانے سے امام کا راستہ بھی بدل گیا۔ اسلام کی راہ راست کے تین اجزاء جو ہیں ان کے لیے یہ ہیں۔ ان کا رستہ ہر جز میں اس سے مختلف ہے:

(۱) دعوتِ باب میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی عطا کردہ طاقت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کی طرف بلا دیا جائے۔ مگر یہ ہندوستان کے باشندوں کو اس طرف بتاتے ہیں کہ تم خود مالکِ ملک بنو یہ غیر الہی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی نہیں کرتے بلکہ صرف انگریزی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی کرتے ہیں۔ اور یہ الہی اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات بھی نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ پانڈن ملک کی خود اختیاری اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ غایت کہ شرک۔ ہونے کی حیثیت سے انگریزی اقتدارِ اعلیٰ اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہذا ان لوگوں کی دعوت سراسر غیر اسلامی بلکہ مخالف اسلام دعوت ہے۔ ان کے نزدیک انگریزی اقتدار کے مقابلہ میں جمہورِ اہل ہند کا اختیار اور الہی شریعت کے مقابلہ میں ہندوستان کی قانون سازی قابلِ ترجیح ہے، حالانکہ اسلامی نقطہ نظر سے دونوں یکساں بغاوت و کفر اور یکساں عصیان و معصیت ہیں پھر انگریز اور ہندوستانی کے درمیان قومی و وطنی عداوت و دشمنی کی آگ۔ پھر کافر میں حصہ لیتے ہیں، حالانکہ اسلام کی دعوتِ عام کے راستہ میں ہر رکاوٹ ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انگریز اور ہندوستانی دونوں انسان ہیں۔ وہ دونوں کو یکساں انسانی دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔ اس کا حشر انگریز سے (۱) بات یہ ہے کہ وہ ایک ملک کا باشندہ ہو کر دوسرے ملک پر حکومت کیوں کرتا ہے۔ بلکہ اس بات پر کہ وہ خدا کی عطا کردہ طاقت اور اس کے قانون کی اطاعت کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ بعینہ اسی بات پر اس کا جھگڑا ہندوستانی سے بھی ہے۔ وہ دونوں ایک ہی باب کی طرف بلا دیتا ہے۔ ایک کا حامی بن کر دوسرے سے لڑنا اس کی حیثیت کے منافی ہے کیونکہ اگر وہ ہندوستانی اور انگریز کے وطنی و قومی جھگڑے میں ایک کا طرفدار اور دوسرے کے مخالف بن جائے تو انگریز کے دباؤ دارہ اس کی دعوت کے لیے بند ہو جائے گا۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرے یا اس کے حقوق تلف کرے تو اسلام مندرجہ قومی حمایت نہ کرتا (باقی اگلے صفحہ پر)



یہ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ ایک طرف اسلام کے داعی بنتے ہیں اور دوسری طرف اس وطنی و قومی جھگڑے میں مبتلا بھی بنتے ہیں وہ دراصل اسلام کے مفاد کو ہندوستانیت کے مفاد پر قربان کر رہے ہیں۔

ان تمام بنیادی غلطیوں کے ساتھ یہ حضرات کبھی کبھی اسلام کی تبلیغ بھی فرمایا کرتے ہیں۔ مگر ایسی تبلیغ کبھی مؤثر نہیں ہو سکتی۔ ایک ساز سے دو بالکل مختلف آوازیں سن کر اور ایک زبان سے دو قطعی متضاد باتیں سماعت کر کے آخر کون متاثر ہو سکتا ہے؟

(۲) تشکیل جماعت کے باب میں یہ حضرات اس سے بھی زیادہ مختلط ہیں۔ اول تو دعوت کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے خود ہی جماعت کی ترکیب اور اجزائے ترکیبی کے متعلق ان کا نقطہ نظر بدل گیا ہے۔ پھر سلمان قوم کے تخیل نے پریشان خیالی کے لئے ایک دروجہ بھی پیدا کر دی ہے۔ ان اسباب سے یہ ہر قسم کے غلط یا بس آدنی اکٹھے کر لیتے ہیں، اور ان آدمیوں کے اقوال و افعال میں بیک وقت بیسیوں قسم کی متضاد باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک متحد المزاج نظریہ کی حمایت کے لیے آپ اٹھیں تو لا محالہ آپ اپنی پارٹی کے لیے انہی آدمیوں کا انتخاب کریں گے جو کیسوی کے ساتھ اس خاص نظریہ کے متبع ہوں۔ بخلاف اس کے ایک مخلوط اور غیر معین مزاج رکھنے والے نظریہ کو لے کر جب آپ اٹھیں گے تو آپ کا معیار انتخاب اکثر اُن قیود سے آزاد ہو جائے گا جو متحد المزاج نظریہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ کچھ مدت ہوئی مجھے ایک مجلس میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا جہاں ہندوستان کی ایک بہت بڑی ذمہ دار جمعیت کی مقامی شاخ کو منظم کرنے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی بحث و تجویس کے بعد جو بات قرار پائی وہ یہ تھی کہ کنیت کے فارم طبع کر ایسے جائیں اور پندرہ دن کے اندر زیادہ سے زیادہ نمبر بھرتی کر کے ارکان کا ایک جلسہ عام کر لیا جائے جس میں عہدہ داروں کا انتخاب ہو جائے۔ لیجیے بس جمعیت کی مقامی شاخ منظم ہو گئی۔ اس طرح بھانت بھانت کے آدمی محض کنیت کے فارموں پر دستخط کر کے اودھ ۴۴ سالانہ فیس ادا

(لغیہ سابق) بلکہ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ زمینیت اور وطنیت کی بنیاد پر دونوں قوموں میں جو نزاع ہو گئی، اسلام اس میں کوئی حصہ نہ لے گا۔

وہ ظالم کو ملامت کرے گا نہ اس لئے کہ وہ فلاں قوم کا آدمی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ظالم ہے۔ اور اسی طرح وہ مظلوم کی حمایت بھی اس حیثیت سے نہ کرے گا کہ وہ فلاں قوم سے تعلق رکھتا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ مظلوم ہے۔



اگر کہ ان جماعتوں میں داخل ہو جاتے ہیں پھر انہی آدمیوں کے دو ٹوٹ سے منتخب ہو کر وہ لوگ سہ کار آتے ہیں جن کا کام رہنمائی دوسرے براہ کاری ہونا ہے اور ایسے ہی لوگوں کی متفقہ خواہشات سے پالیسیاں بنتی اور نکل جاتی ہیں کیا کوئی شخص توقع کر سکتا ہے کہ جماعتی تشکیل کے اس طریقے سے کبھی اسلامی نصب العین کی طرف بھی کوئی پیش قدمی کی جاسکتی ہے؟

(۳) اسی طرح تیسرے خبر میں بھی ان کا طریقہ اسلام کی راہ راست بٹا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض

کیا اسلام براہ راست غیر اسلامی نظام اطاعت پر حملہ کرتا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام سماعی کو حاکمیت رب العالمین کے قیام و اثبات پر مرکوز کر دیا جائے۔ لیکن اس کے برعکس یہ لوگ اپنی سعی و جہد کا رخ برطانوی نظام اطاعت کی تخریب اور حاکمیت عوام کے قیام کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ یہ صریح انحراف ہے جس کا مستقیم سے اس انحراف پر حسب اعتراض کیا جاتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ برطانوی نظام اطاعت اسلامی نصب العین کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، ہم نہ اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتے، اس لیے پہلے دوسروں کی مدد سے اس کو دور کریں، پھر اصل منزل مقصود

کی طرف بڑھنے کے لیے راستہ آسان ہو جائے گا۔ مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ راستہ آسان کیسے ہو جائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک نظام اطاعت یا دین کو بٹا کر اس کی جگہ دوسرے نظام اطاعت یا دین کبھی قائم نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ ہمیں انسانی میں پہلے نظام کی تخریب اور دوسرے نظام کی تعمیر کا خیال اور ارادہ کمال درجہ قوت کے ساتھ مستحکم نہ کر دیا جائے۔ اگر ہندوستان کے موجودہ انگریزی نظام اطاعت کی جگہ آپ جمہوری نظام اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب صرف اسی طرح ممکن ہے کہ آپ باشندگان ہند کے دلوں میں حاکمیت انگریز کے بجائے خود اپنی حاکمیت برحق ہونے کا تخیل اور عقائد ملک بن جائے گا۔ عوام پوری فہمت کے ساتھ پیدا کریں۔ برعکس میں کے اگر آپ ہندوستان میں الہی نظام اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب بغیر ان کے ممکن نہیں ہے کہ عوام انہیں کو خود اپنی حاکمیت کے دعوے سے دست بردار ہوں اور غیر اللہ کی حاکمیت کا یہ رویہ برآوردہ کریں اور اللہ کے مالک ملک ہونے کا عقیدہ ان کے دلوں میں اتنی قوت کے ساتھ ٹھکانیں کہ وہ اس کی حاکمیت کے آگے ہر فضا و زمین پر قربان کر دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا آخری مقصد الہی نظام اطاعت قائم ہے وہ کس طرح بحالت ہوش و حواس اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ذریعہ کے طور



یہ تدبیر اختیار کر سکتے ہیں کہ عوام الناس کے دل میں خود اپنی حاکمیت عقیدہ اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھادیں کہ اس کے زور سے دین انگریز کی مضبوط جہی ہونی چڑھ جائے اور دین جمہور کی جہیں زمین میں جگہ پکڑ لیں یہ جہاں عارضہ قوت کے دلوں میں اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور غم اتنی قوت کے ساتھ جم گیا ہو کہ وہاں لوگوں کو خداوند عالم کے آگے اپنی حاکمیت سے دست بردار ہو جانے پر آمادہ کرنا موجودہ انگریزی حاکمیت کی جہیں اکھاڑنے سے کچھ کم مشکل ہے یہ کیا امر کیا ہو چکا ہے۔

جرمنی اور انگلستان جیسے اصطلاحاً آزاد ممالک میں حکومت الہی کا قیام اس سے کچھ کم دشوار ہے جتنا ہندوستان جیسے اصطلاحاً غلام ملک میں دشوار نظر آتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور قیناً نفی ہی میں دیا جاسکتا ہے، تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برطانوی اقتدار کی جگہ ہندوستانی اقتدار کا قیام آخر کس معنی میں حکومت الہی کے قیام کی طرف ایک گونہ پیش قدمی ہے۔

نام گرتھوری دیکھ لیں یہ مان بھی لیا جائے کہ بہ تدبیر عملاً کارگر ہو سکتی ہے تب بھی میں اس کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہوں۔ لازم نہیں کہ بہ تدبیر جو کارگر ہو وہ صحیح بھی ہو۔ دراصل یہ محنت ناپاک تدبیر ہے جسے اختیار کرنے کا خیال بھی ایک سمدان دل میں نہیں لاسکتا جو شخص درحقیقت پوری سچائی کے ساتھ اللہ کے مالک ملک ہونے پر ایمان رکھتا ہو وہ آخر کس دل سے یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے ایمان کے خلاف عوام الناس میں اس عقیدے کی تبلیغ کرے کہ تم خود مالک الملک ہو؟ جس شخص کا اعتقاد یہ ہو کہ انسان کی انفرادی اجتماعی زندگی صرف حدود اللہ کی پابندی پر ہے اور حکومت وہ ہونی چاہیے جو اللہ کے سامنے جواب دہ ہو وہ کیونکر اپنی کوششوں کا مقصود یہ قرار دے سکتا ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی پر محدود جمہور کا تسلط قائم ہو اور حکومت جمہور کے سامنے جواب دہ ہو؟ کس طرح ایک سچے آدمی کی زبان ایسے عقیدے کی اشاعت یا حمایت میں گھل سکتی ہے جس کو وہ فی الواقع باطل سمجھتا ہے، اور کس طرح وہ اس چیز کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کر سکتا ہے جو اس کے اعتقاد میں حق نہیں بلکہ طاغوت ہے؟

یہ تو کچھ میں نے عرض کیا، بہ تو محض اس امر کا ثبوت ہے کہ ان لوگوں کا راستہ اسلام کی راہ راست سے منحرف ہے یہی بات کہ اس پھر کے راستے سے یہ لوگ کبھی اسلام کے نصب العین بن سکتے، تو اس دعوے پر میرے



پاس یہ دلیل ہے کہ جن مشکلات سے خوفزدہ ہو کر انھوں نے یہ پھیر کی راہ اختیار کی ہے وہ ہندوستان کے انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد بھی جوں کی توں قائم رہیں گی۔ اوپر میں نے مشکلات کی جو تشریح کی ہے ان پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ کیا ان میں سے کوئی مشکل بھی خود مختار ہندوستان کے دور میں دُور ہو جائے گی؟ اگر نہیں، تو جو لوگ آج ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی حکمت اور بہت نہ رکھنے کی وجہ سے راستہ کھرا کر نکل رہے ہیں وہ کل بھی اسی وجہ سے اصل مقصد اسلامی کی طرف براہ راست پیش قدمی کرنے سے جی چرائیں گے۔ خوب جان لیجیے کہ اس مقصد کی طرف جب بھی آپ اقدام کرنا چاہیں گے، بہر حال آپ کو ان مشکلات سے سابقہ پیش آئے گا۔ جو لوگ ان کا مقابلہ کرنے کی تدبیر اور عزم نہیں رکھتے وہ موجودہ حالات سے نہیں بلکہ کسی حال میں بھی اس طرف اقدام نہیں کر سکتے۔ اور جن کے پاس تدبیر اور عزم دونوں موجود ہیں، اُن کے لیے کسی پھیر کے راستہ پر چلنا تقصیرِ وقت اور حماقت ہے، وہ تو اس پہاڑ کو کاٹ کر براہ راست ہی اپنے مقصد کی طرف قدم بڑھائیں گے۔

پاکستانی خیال کے لوگ | دوسرا گروہ زیادہ تر اس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تدریجاً مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے۔ یہ لوگ یا اسی فکر تو مغربی مآخذ سے لیتے ہیں، مگر چونکہ موروثی طور پر اسلام کے حق میں ایک تعصب ان کے اندر موجود ہے، اور مسلمان قوم ہونے کا شعور ان کے اندر سیدر ہو گیا ہے اس لیے جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں مسلمان قوم کے لیے اسلام کے نام ہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اقوال اور اعمال میں اسلامی اصطلاحات اور مغربی طرز فکر و عمل عجیب طریقہ سے خندہ بدھ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس مضمون میں یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس خلطِ ممیخت کا تجزیہ کر کے تفصیل کے ساتھ اس فحوظ کے ایک ایک جزر کی اصل و نوعیت کا نشان دہی سکوں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے میں صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے گروہ کی طرح اس گروہ کا راستہ بھی راہِ راست کے قیاموں اور اجزاء سے منحرف ہے۔

۱۱۔ پہلے دعوت کو لیجیے۔ ان کے ذمہ دار بیٹے روک کی تقریریں، ان کی نمائندہ مجلسوں کی قراردادیں، ان کے کارکنوں کی باتیں، ان کے اہل فہم کی تحریریں سب کی سب اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ ان کی دعوت اصل میں



ایک قوم پرستانہ دعوت ہے، یعنی ان کی پکار اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں ہے بلکہ اس طرف ہے کہ ان کی قوم متفق و متحد ہو کر ہندو قوم کے مقابلہ میں اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کرے۔ گویا جس طرح آزادی پسند لوگوں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنایا ہے اسی طرح انھوں نے ہندوؤں کو اپنا قومی حریف بنایا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اور آزادی پسند حضرات ایک سطح پر کھڑے ہیں لیکن جس چیز نے ان کی نسبت ان کی روش کو اسلام کے لیے اور زیادہ مضر بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تو وطن اور وطنی مفاد کے نام پر لڑتے ہیں، مگر یہ اپنی قومی اور دنیوی لڑائی میں بار بار اسلام اور مسلمان کا نام لیتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام خواہ مخواہ ایک فریق جنگ بن کر رہ گیا ہے اور غیر مسلم قومیں اس کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف سمجھنے لگی ہیں۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اسلام کی دعوت کے لائق نہیں دکھا ہے بلکہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں اتنی بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے کہ اگر دوسرے مسلمان بھی یہ کام کرنا چاہیں تو غیر مسلموں کے دلوں کو اسلام کے لیے مقفل پائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قوم پرستانہ دعوت کے ساتھ یہ لوگ کبھی کبھی اسلام کی خوبیاں اور اس کے اصولوں کی نفی نہ بھی بیان کیا کرتے ہیں۔ مگر اول تو قوم پرستی کے پس منظر میں یہ چیز ایک اصولی دعوت کے بجائے محض ایک قومی تفاخر بن کر رہ جاتی ہے۔ اور مزید برآں دعوت اسلام کے ساتھ جن دوسری باتوں کی یہ آمیزش کرتے ہیں وہ بالکل اس دعوت کی ضد ہیں۔ ایک طرف اسلامی نظام حکومت کی تبلیغ اور دوسری طرف ان مسلمان ریاستوں اور حکومتوں کی حمایت جن کا نظام بالکل غیر اسلامی ہے، ایک طرف اسلامی نظام معاشی کی تشریح اور دوسری طرف خود اپنی قوم کے قارونوں کی تائید و مدافعت، ایک طرف انسانی قانون سازی کا اصولی ابطال اور دوسری طرف خود قانون ساز مجالس میں اپنے حصہ کا مطالبہ ایک طرف حاکمیت رب العالمین کا اقرار و اثبات اور دوسری طرف حاکمیت جمہور کے اصول پر خود اپنی قومی حکومت کے قیام کی فکر، ایک طرف انسانیت کی نسلی، قومی اور وطنی تقسیم کا ابطال اور دوسری طرف ہر وقت قوم قوم کا شعور اور خود قومیت ہی کے اصولوں پر دوسری قوموں سے جدال و کشمکش، ایک طرف بے غرضانہ حق پرستی کا دعویٰ اور دوسری طرف شیعہ روز اپنے دنیوی مفاد کا نوحہ و اتم، ایک طرف اسلامی تہذیب تمدن پر فخر و تاز اور اس کی حفاظت کے لیے پُر شور لام بندی اور دوسری طرف اسی تہذیب و تمدن کے باغیوں اور



قانون کی سرداری و پیشوائی، یہ دونوں چیزیں آخر کس طرح ایک ساتھ بچ سکتی ہیں؟ منکرے بودن و ہمنگ متاں  
زیستن۔ ایسی متضاد باتوں سے دنیا نے کب نہ قبول کیا ہے کہ آج ان سے اسلام کا جھنڈا زمین میں گڑ جانے کی امید کی جاتی ہے

(۲) اب دیکھیے کہ یہ اپنی جماعتی تشکیلات کس ڈھنگ پر رکھتے ہیں۔ ان کا قاعدہ یہ ہے کہ یہ اُن سب لوگوں کو جو از رو

پیدا ہن مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اپنی جماعت کی رکنیت کا ایسا وارثیتے ہیں اور جو اس کو قبول کرے اُسے ابتدائی

رکن بنا لیتے ہیں۔ پھر انہی ابتدائی ارکان کے ووٹوں سے ذمہ دار کارکن اور مہدہ دار منتخب ہوتے ہیں اور انہی کی کثرتِ ثنائے

سے تمام معاملات انجام دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صرف قومی تنظیم سی کے لیے موزوں ہو سکتا ہے اور اس

طریقہ سے جو نظام بنے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ ایک قوم کی خواہشات جیسی کچھ بھی ہوں اُن کے حصول کی کوشش

کرے۔ رہی ایک صوبائی تحریک، تو اس کو چلانے کے لیے یہ طریقہ جماعت سازی نہ صرف بے کار بلکہ مضر ہے۔ ایک قوم

کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ اُن کے اجتماع

سے جو کام بھی ہو گا اسلامی اصول ہی پر ہو گا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یا نبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے،

اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ

ان کا اخلاقی نقطہ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہو سکتا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا

نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انھوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر

اُسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے

راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(۳) اس کے بعد اس طریقہ کا جائزہ لیجیے جس سے یہ بزرگ خود اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی امید رکھتے ہیں۔

ان کی تجویز یہ ہے کہ پہلے اُسی جمہوری دستور کے مطابق، جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے مسلم اکثریت کے

نمبروں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے، پھر کوشش کی جائے گی کہ یہ قومی حکومت اسلامی نظامِ حکومت میں بندوبست

تبدیل ہو جائے۔ لیکن یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی "آزادی ہند" کو مقدم رکھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ اُن کی تجویز پر مجھے



جو اعتراضات ہیں بعینہ وہی اعتراضات ان کی تجویز پر بھی ہیں۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے مصلوحتوں میں حاکمیت جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیت رب العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ جیسی مسلم اکثریت اس مجوزہ پاکستان میں ہے، ویسی ہی، بلکہ عددی حیثیت بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، عراق، ترکی اور مصر میں موجود ہے اور وہاں اس کو وہ پاکستان حاصل ہے جس کا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت کسی درجہ میں بھی حکومت انبیہ کے قیام میں مددگار ہے یا عوقی نظر آتی ہے؟ مددگار ہونا تو درکنار میں پوچھتا ہوں کہا آپ وہاں حکومت انہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلا وطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟ اگر آپ وہاں کے حالات کچھ بھی واقف ہیں تو آپ اس سوال کا جواب ثبات میں دینے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ اور جب صورت حال یہ ہے تو آپ غور کرنا چاہیے کہ آخر اسلامی انقلاب کے راستہ میں مسلمان قوموں کی ان آزاد حکومتوں کے سبب راہ ہونے کا سبب کیا ہے۔ اس معاملہ کی جتنی تحقیق آپ کریں گے جواب اس کے سوا کچھ نہ پائیں گے کہ دراصل اصطلاحاً و نسلاً مسلمان ہونا اور چیز ہے اور نظریہ حیات و مقصد زندگی کا اسلامی ہونا بالکل ایک دوسری چیز جو لوگ روح و اخلاق کے اعتبار سے

(حاشیہ صفحہ سابق) سہ اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوٹن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میرے ج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ایک ایسی جمہوری حکومت جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں، اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظ دیگر ان کو مطمئن کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبہ آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے، باقی رہا نظام حکومت تو وہ پاکستان میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ہندوستان میں ہوگا۔ ان کے اس نصاب العین پر جب یا قراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطہ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابل ترجیح نہیں ہے۔ ہذا اس سے بھی زیادہ قابل لعنت ہے، تو تو یہ دارلیداروں میں سے تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا، البتہ جو لوگ پاکستانی حلقوں کی صفِ آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جن کی کوئی ذمہ دارانہ حیثیت نہیں ہے انھوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم اکثریت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائے گی تب ہم نظام حکومت بدلنے کی کوشش کریں گے۔



مسلم نہ ہوں بلکہ محض اصطلاحی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہوں ان کو اگر ہر دینی اثر و اقتدار سے کامل آزادی نصیب بھی ہو جائے، اور اگر ان کے جمہور کو خود اپنی پسند کے مطابق نظام حکومت قائم کرنے کا پورا اختیار بھی حاصل ہو، تب بھی حکومت الہی وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ اپنے دنیوی مفاد کے پرستار ہوتے ہیں نہ صرف یہ کہ ان میں حق اور صداقت کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنے کی طاقت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس جب بھی ان کی اغراض دنیوی سے حق و صداقت کا تضاد مہم ہوتا ہے، وہ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ اُس طرف جاتے ہیں جس طرف ان کی اغراض پوری ہوتی ہیں۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی امید نہیں کی جاسکتی کہ عام انتخاب میں ان کے دعوؤں سے وہ صالحین منتخب ہوں گے جو منہاج نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر گھٹن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو گھٹن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہو گا۔ اسی طرح سوسائٹی اگر بگڑی ہوئی ہو تو اُس کے دعوؤں سے وہی نیک منتخب ہو کر ہر اقتدار اُن کے جو اس سوسائٹی کی خواہشات نفس سے سبقت قبولیت حاصل کر لیں پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومت الہی لکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کر کے، جن کے نقطہ نظر کو تبدیل کر کے، ورنہ ان کے نفسیات میں انقلاب برپا کر کے ایک جمہوری نظام کو الہی حکومت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و ذہنی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی؟ کیا وہ لوگ جو موجودہ بڑی ہوئی سوسائٹی کے مادی مفاد سے اپیل کر کے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے ان سے اب یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کا یہی اس کے دہلے اور اس کے اختیار کسی ایسی تحریک کی امانت میں صرف کریں گے جس کا مقصد عوام کی ذہنی و اخلاقی تبدیلی کرنا اور انہیں حکومت الہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ جس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا۔ مگر یہ سب کہ بہ لوگ اس انقلاب میں مدد دیتے ہیں اُن کی مہمت کریں گے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر



عوام کے نفسیات میں تغیر واقع ہو گیا تو اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں اُن کا چراغ نہ جل سکے گا یہی نہیں، اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت و بے باکی کے ساتھ ایسی برکوشش کو کھلیں گے اور اُن کے نام اُن کے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوں گے جب صورتِ معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اس کے مقصد کی راہ میں حائل ہوگی؟

**تخریفِ دین کے مجوزین** | اب تیسرے گروہ کو بھیجیے۔ یہ لوگ مختلف قسم کی تجویزیں سوتی رہے ہیں۔ کوئی فکرِ اسلامی کے ساتھ غیر اسلامی افکار کا جوڑ لگا کر ایک نئی "خوشگوار" معجون بنانا چاہتا ہے۔ کوئی اس خیال میں ہے کہ "ہندوستانی اسلام" کا ایک نیا ایڈیشن نکالے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اس کے سیاسی و معاشی اصولوں کو لے لیا جائے اور ان کی بنیاد پر ایک ایسی جماعت بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے عقائد، عبادات اور احکام نہ عیب کی پابندی لازم نہ ہو۔ یہ سب لوگ اپنے نزدیک نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان طریقوں سے رفتہ رفتہ وہ تنفر دور ہو جائے گا جو اسلام کے خلاف طبیعتوں میں پیدا ہو گیا ہے، اور جب وہ بعض اسلام سے کسی حد تک مانوس ہو جائیں گے تو پورے اسلام سے مانوس ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔

لیکن یہ سب خیالات خام ہیں۔ نہ اصولی حیثیت سے ان کو صحیح کہا جاسکتا ہے اور نہ عملی حیثیت سے ہی ان کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ میرے نزدیک ایسی تمام تجویزیں ضعیف دل اور ضعیف دماغ کا نتیجہ ہیں۔

اصولی حیثیت سے درحقیقت ہم اسلام میں کسی رد و بدل، کسی کمی بیشی، اور کسی ترمیم و تہذیب کے مجاز ہی نہیں ہیں ہم اسلام کے مالک نہیں ہیں، اس کے شارع نہیں ہیں، اسلام ہمارا مال نہیں ہے کہ مارکیٹ میں جیسی غلب ہو اس کے مطابق اپنے اس مال کو بنا کر بازار میں لائیں۔ ہماری حیثیت صرف پیر و اور مبلغ کی ہے۔ مالک نے عقائد، عبادات اور احکام کا یہ پورا مجموعہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم خود اس کی پیروی کریں اور دوسروں تک اسے پہنچائیں۔ اس مجموعہ میں کوئی ترمیم کرنے کا، یا اس کی اصلی صورت کو بدل کر اس کی کوئی اور صورت بنانے کا ہم کو ہرگز کوئی حق نہیں پہنچتا جس کو



لینا ہے اسے پورے مجموعہ کو لینا پڑے گا اور اسی صورت میں لینا ہوگا جس میں مالک نے اسے دیا ہے۔ اور جو اس کو اس معیشت مجموعی اور اس مقرر صورت کے ساتھ نہ لینا چاہے اس کی خوشامد کرنے اور اسے کم و بیش پر راضی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام تو ایک حکم ہے خالق کی طرف سے مخلوق کی طرف۔ خالق کا کام مخلوق کی خوشامد کرنا اور اس کو راضی کرنا نہیں ہے۔ مخلوق کو یا تو اس کا حکم، جیسا کہ وہ ہے، جوں کا توں ماننا پڑے گا۔ ورنہ وہ خود اپنا ہی کچھ بگاڑے گی، خالق کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ اسی لیے اللہ کی طرف سے اس کے جو رسول دینے میں آئے انہوں نے پورے حکم کو لوگوں کے سامنے بعینہ پیش کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ چاہو اس کو اور چاہو رد کر دو، بہر حال تمہاری خواہشات کے مطابق اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جائے گا۔ ٹھیک یہی پوزیشن رسول کے نائب ہونے کی حیثیت ہماری بھی ہے۔

پھر کتنی غیر معمولی تجویز ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اس کے معاشی و سیاسی اصول کو لے لیا جائے اور انہی کی بنیاد پر ایک پارٹی ایسی بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے توحید، آخرت، قرآن، رسالت، کسی چیز پر بھی ایمان لانے کی ضرورت نہ ہو اور نہ عبادات کی بجا آوری اور احکام شریعیہ کی پابندی ضروری ہو۔ کیا کوئی صاف نظر آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ کسی اجتماعی نظریہ اور لائحہ عمل کو اس کے بنیادی فلسفے، اس کے نظام اخلاق اور اس کے تعمیرِ سیرت کرنے والے ارکان سے الگ کر کے چلایا جاسکتا ہے؟ اللہ کی حاکمیت کا تصور نکال دینے کے بعد اسلام کا سیاسی نظام آخر ہے کس چیز کا نام؟ اور اگر قرآن کو ماحذ قانون اور محمد رسول اللہ کو رعیت (السان) اور پادشاہ (اللہ) کے درمیان نزول احکام کا واحد مستند ذریعہ نہ مانا جائے تو کیا اسلامی طرز کے اسٹیٹ کی تعمیر ہو اور کیا جائے گی؟ نیز وہ کونسا نظام تمدن و سیاست ہے جو کسی نظام اخلاق کا بہا رہے بغیر قائم ہو سکتا ہو؟ اور کیا اللہ کے سامنے انسان کی ذمہ داری و جواب دہی کا تخیل نکال دینے کے بعد اس نظام تمدن و سیاست کے لیے کوئی اخلاقی سہارا باقی رہ جاتا ہے جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے؟ کیا اس نظام کو آپ مادہ پرستانہ اخلاقیات کے بل پر ایک دن کے لیے بھی قائم کر سکتے ہیں؟ مزید برآں وہ خاص قسم کی انفرادی سیرت اور جماعتی زندگی جو اس نظام تمدن و سیاست کے لیے درکار ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے سوا اور کس ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور وہ نہ ہو تو یہ نظام چل کہاں



ہے ۹ پس یہ غایت درجہ کا انداز فکر ہے کہ کوئی شخص محض شاخوں کا حسن دیکھ کر کہنے لگے کہ آؤ جوڑ کے بغیر ان شاخوں ہی سے درخت قائم کریں۔

عملی حیثیت سے بھی اس قسم کی تمام تجویزیں سراسر غلط ہیں۔ ان سے اصل مقصد تک پہنچنے کے بجائے خطرہ یہ ہے کہ کہیں ہم خود ہی راستہ میں گم نہ ہو جائیں۔ ترمیم شدہ صورت میں جس نام نہاد اسلام کی تبلیغ کی جائے گی، ایک دوزوہی اصل معیار بن جائے گا، اور جو لوگ اس پر ایمان لاکر جماعت میں شریک ہوں گے، نہ صرف وہ خود اصل اسلام کی طرف رجوع کرنے سے انکار کریں گے بلکہ وہ مصلحت پرست مسلمان بھی جنہوں نے ان سے کم پیش پر سودا کیا تھا، ان کے ساتھ ان کی گمراہی میں شریک ہو جائیں گے۔ مدارات (Compromise) پر جو کام مبنی ہوتے ہیں ان میں ہمیشہ ہی خرابی ہوتی ہے۔

## ۶۔ مشکلات کا جائزہ

اب ہمیں ایک نظر ان مشکلات پر ڈالنی چاہیے جن سے خوف زدہ ہو کر یہ انحراف کی راہیں اختیار کی جا رہی ہیں کیا حقیقت میں وہ ایسی ہی مشکلات ہیں کہ ان کو حل نہیں کیا جاسکتا؟  
تکرار بیان سے بچنے کے لئے میں ناظرین کو پھر ایک مرتبہ تکلیف دوں گا کہ پیچھے پلٹ کر مضمون کے اُس حصہ پر نگاہ ڈالیں جہاں میں نے ان مشکلات کی تشریح کی ہے۔

**پہلی مشکل** پہلی مشکل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام صرف تمدنی، سیاسی اور معاشی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد، عبادات اور ضوابط شرعیہ کا ایک مجموعہ بھی اس کے ساتھ دیتا ہے، اور اس کو قبول کرنے کے معنی انسان کی پوری زندگی تبدیل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز اسلام کو اس طرح پھیلنے نہیں دیتی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔ لیکن یہ مشکل بظاہر عینی زبردست نظر آتی ہے، مگر باطن اتنی ہی کمزور اور بے حقیقت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظریہ اور مسلک بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کا مجرد حل پیش کرتا ہو اور اس کے ساتھ اپنے کچھ اعتقادات اور اپنا ایک مخصوص فلسفہ نہ رکھتا ہو۔ چند امور بالبعد الطبیعت (

Metaphysical problems) ایسے ہیں جن کے متعلق سلبی یا ایجابی حیثیت سے ایک نہ ایک رائے قائم کرنا بہر حال



ہر اس مسئلہ کے لیے ناکریر ہے جو انسان کے لیے ایک ناکریر زندگی بنائے گا غم کرے۔ یہ سوالات کہ کائنات کیا یہ نظام کس نوعیت کا ہے؟ اور اس نظام میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور انسان کی زندگی کا مال کیا ہے؟ اور یہ کہ دنیا میں سب کچھ تو انسان کے لیے ہے مگر انسان خود کس کے لیے ہے، یہ دراصل انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں جن کا ایک قابل عمل حل *Workable Solution* پیش کیے بغیر کوئی ذہنی، اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی نظام بنایا ہی نہیں جاسکتا اور کسی نظام کے بغیر محض علم، پیلوں کو کب کراؤنی کام نہیں کر سکتا جب تک کہ ساتھ ساتھ اس کے بنیادی فلسفہ، یا بالفاظ دیگر اس کے اعتقادات، رکھی قبول نہ کرے۔ پس ایک اعتقادی نظام ہونا تھا، اسلام ہی کی کوئی انوکھی خصوصیت نہیں ہے۔ اس جہت سے "اسلام کی بنیاد کوئی شکل حاصل ہے تو ایسی شکل ہر اجتماعی سائیک کی راہ میں مل جاتی ہے۔ ہر اجتماعی مسئلہ فی الواقع ایک مذہب ہی ہے اور جو بھی اس کی پیروی اختیار کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر رہا ہے خواہ اسی سادہ لوحی کی بنا پر یہ کہتا اور سمجھتا رہے کہ بدستور اپنے پہلے مذہب پر ہوں۔

میں ایک بدعتی سی مثال سے، مسئلہ کو زیادہ واضح کر دوں گا۔ یہ کیونکر ہم آپ کے سامنے ہے۔ اسی کو مثال میں لے لیجئے۔ اگر اسلام اس مابعد الطبیعی نظریہ سے اپنے مسئلہ کی ابتدا کرتا ہے کہ خدا ہے، تو کیونکر ہم اس نظریہ سے چلتا ہے کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم ان کے وجود ہمارے لیے خارج از بحث ہے۔ اگر اسلام یہ نقطہ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا خدائی ساخت ہے اور انسان اس میں اس طرح مایوس ہے تو کیونکر ہم یہ نقطہ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی بساط ہے اور انسان یہاں طوفانِ خود رفتاری *Indeterminacy* ہے۔ اگر اسلام یہ پہلو اختیار کرتا ہے کہ انسان کو یہاں کام کرنے کے لیے خدا کی ہدایت و کار سے دور کر کے ذریعہ سے آتی ہے تو کیونکر ہم یہ پہلو اختیار کرتے ہیں کہ کئی بدعتیہ کا نہیں اور سچی نہیں آتی۔ اگر اسلام اس خطہ میں لوگ کا آغاز کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسان کو موجودہ زندگی کے برعکس کائنات کا سامنا کرنا ہے تو کیونکر ہم اس مسئلہ سے بے نیاز ہو جاتے ہیں کہ زندگی ہے اور بعد میں نہ کوئی زندگی ہے نہ نہایت کتاب دیکھتے ہیں دونوں کی اس مابعد الطبیعی نظریہ میں اور دونوں میں



سے کسی کو بھی تجربہ یا مشاہدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اب اگر کسی سائنٹیفک ثبوت کے بغیر محض تئدلال اور قلمی ثبوت کی بنا پر بہت سے وہ لوگ جو کل تک کمیونسٹ نہ تھے، آج کمیونزم کے نقاب نظر کو قبول کر سکتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ آخر انھی دو دنیا دول پر بہت سے وہ لوگ جو آج مسلم نہیں ہیں، کل اسلام کا نقطہ نظر کیوں قبول نہیں کر سکتے؟

اسی طرح ایک ہادی پر ایمان لانے کا معاملہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مسلم ہونے کے لیے محمد رسول اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے تو کمیونسٹ بھی آخر مارکس پر ایمان لاتا ہی ہے۔ پھر اگر ایک شخص جو کل تک مارکسی نہ تھا، آج مارکس کی تعلیمات کو دیکھ کر اس کو اپنا رہنما تسلیم کر سکتا ہے تو آخر کونسی چیز مانع ہے کہ ایک وہ شخص جو کل تک مسلم نہ تھا، آج محمد رسول اللہ کی زندگی، ان کی تعلیمات اور ان کے کارنامے کو دیکھ کر ان کو اپنا ہادی و رہنما تسلیم نہ کرے؟

ایسا ہی معاملہ جماعتی ضوابط (Party-discipline) کا بھی ہے۔ اگر اسلام ان لوگوں کو جو اس کی جماعت میں شامل ہوں، اپنے کچھ ضوابط کا پابند بناتا ہے تو کیا کمیونسٹ پارٹی ان لوگوں کو جو اس میں شامل ہیں کسی ضابطہ اور کسی قاعدے میں نہیں جکڑتی؟ پھر جب بہت انسان کمیونزم کے اصولوں پر ایمان لانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ضوابط کی پابندی قبول کرتے ہیں تو آخر اسلام ہی کے جماعتی ضوابط میں کونسا ہوتا چھپا ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کے اصولوں کو جان بچ کر ان پر ایمان لانے کے لیے تیار ہوں گے ان کو یہ ہوتا اپنی صورت دکھا کر بھگا دے گا؟

اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خدا کی ہستی اور اس کی توحید کا اعتقاد یا آخرت کا اعتقاد یا پیغمبر کی ناقابل منازعت پیشوائی Indisputable Leadership اور قرآن کے آخری منہج قانون ہونے کا اعتقاد شرط لازم ہونا، اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضوابط کی پابندی فرض ہونا، ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے پھیلنے اور غیر مسلموں کے اس کی طرف کھینچ کر آنے میں سد راہ ہو۔ مابعد الطبیعی اعتقادات اور جماعتی ضوابط دوسرے مسئلوں میں بھی موجود ہیں، اور جو انسان ان مسکون میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل اپنی سمجھ کے مطابق صحیح پانے میں وہ ان کے غمناک اور ضوابط دونوں کو قبول کرتے ہی ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر اسلام ان کے سامنے تمام مسائل زندگی کا بہترین حل پیش کرے، اور ان کی اپنی فلاح و سعادت کا راستہ کھول کر ان کے سامنے رکھ دے تو عقائد اور ضوابط کی شرط صفر



اسلام ہی کے معاملہ میں ان کے لیے غیر معمولی رکاوٹ ثابت ہو۔ رکاوٹ اگر ہے تو فی الواقع صرف اسی حد تک ہے کہ لوگوں کے لیے بالعموم اپنے پڑانے مسلک کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جو تحریک بھی دنیا میں پھلتی ہے اسے بہر حال اس رکاوٹ سے سابقہ پیش آتا ہی ہے اور جو لوگ کسی تحریک پر ایمان لاتے ہیں وہ بہر حال اس رکاوٹ کو عبور کر کے ہی آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ اس کو سامنے کھڑا دیکھ کر راستہ کترانے کی کوشش صرف وہی شخص کرے گا جو یا تو اپنے ایمان ہی میں صادق نہیں ہے یا پست ہمت اور ناکارداں ہے۔

البتہ اسلام کے حق میں اس رکاوٹ کو جس چیز نے شدید تر رکاوٹ بنا دیا ہے وہ ہماری یہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جا رہا ہے۔

اس بے روح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد محض ایک دھرم (RELIGION) کے موعومات بنا کر رکھ دیے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفہ اجتماع اور نظام تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اس کی عبادات محض پوجا اور تمہیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں حالانکہ وہ ان ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظام اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عمل تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی دائرہ عمل کو چلانے کے لیے ان عقائد اور عبادات کی ضرورت ہی کب ہے۔ دوسرا بنیادی نقص اس نسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گذشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثار قدیمہ کے محافظانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اس قدر شناسی تو کر سکتے ہیں، مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جاسکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کیسے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔

تیسرا نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر مخصوص تعین، اور روح سے بڑھ کر



پر مدار دین داری رکھنے کی پیروی اس میں حد سے بڑھ گئی ہے۔ اور دونوں دن کی تالیف تو کیا کرے گی انہی چیزوں کی  
تغیر کا باعث بن رہی ہے۔ اس غلط مدعا کے ساتھ ہی دونوں کی زندگیوں کی باتیں سن کر آدمی اس سوچ میں پڑتا  
ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خیران کا مدار کیا اچھی چیز پر ہے یا خیر؟ یہ یہ لوگ اتنا رو رہے ہیں؟

اسلام کے راستہ میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے مگر یہ اسلام کو تصور نہیں ہمارا اپنا تصور ہے اور ہمارا فرض  
ہے کہ اسے اس نظام تعلیم کو بدلیں جس نے دین کے تصور کو اتنا غلط اور شریعت کے علم کو اس قدر جامد بنا دیا ہے۔  
ظاہر ہے کہ ایک زندہ فکر ایک علمی عقائد کے بل پر نہیں اٹھ سکتی۔ ہمیں اس کے عقائد کو معقول دلائل کے ساتھ پیش کرنا  
ہوگا۔ پھر عقائد کے ساتھ عبادات کا اور عبادات کے ساتھ زندگی کے قوانین کو منطقی ربط و رابطہ کرنا پڑے گا۔ پھر ان قوانین کو زندگی  
کے تمام عملی مسائل پر مطبق کر کے نہایت گونا گونا گونی انسانی ضروریات میں ان سب کا حل ان قوانین میں موجود ہے تب کہیں  
لوگ اس نظام کو ایک معقول نظام کی حیثیت سمجھ سکیں گے۔ اور جب وہ اسے سمجھیں گے تو قبول بھی کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ  
تعمیری کام ہے جو کہ بہت محنت کا ہے اس لیے اس محنت سے جی چڑھ کر لوگ بنے بنائے آسان راستوں کی طرف دوڑ جاتے ہیں  
مگر یہ نہیں دیکھتے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے راستہ بنانے کی زحمت بہت سہی اٹھانی ہی پڑے گی جس نے بھی کوئی  
مقصد تعلیم میں ناکارہ کیا ہے اسے یہ زحمت اٹھانی پڑی ہے۔ اور اگر واقعی ہم اپنے مقصد میں صادق ہیں تو ہمیں اس کام  
کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

دوسری شکل اب دوسری شکل کو ہم نے جن تعصبات کو اسلام کی راہ میں حائل بنایا جاتا ہے ان کا تجزیہ کرنے سے معلوم

ہوتا ہے کہ یہ تعصبات کون سے ہیں۔  
ایک قسم کا تعصب تو وہ ہے جو علماء شریعت کے اندر اس چیز کے خلاف ہوتا ہے جو اس کے لیے نئی ہو جس پر اس نے  
اپنے باپ دادا کو نہ پایا ہو اور جس سے وہ مانوس نہ ہو یہ تعصب صرف آج ہی اسلام کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ پہلے بھی  
حائل تھا۔ اور جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، یہ صرف اسلام ہی کی راہ میں حائل نہیں ہے، ہر تحریک کی راہ میں حائل  
ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایسی رکاوٹ نہیں ہے جس کو دور نہ کیا جاسکتا ہو۔ پہلے ہی اس رکاوٹ کے باوجود اسلام پھیل رہا ہے



اور اب بھی پھیل سکتا ہے۔

دوسری قسم کا تعصب وہ ہے جو دراصل اسلام کے خلاف ہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف پیدا ہوا ہے اور مسلمانوں کے واسطے سے اسلام کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے پچھلی کئی صدیوں میں جو غیر اسلامی طریقے اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں اختیار کئے اور اب بھی اپنے انفرادی کردار اور جماعتی رویے میں جس غیر اسلامی ہیرت کا وہ اظہار کر رہے ہیں یہ سارے تعصبات فی الحقیقت اسی کے بھڑکائے ہوئے ہیں۔

اس واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان کو اصلی اسلامی حکومت، خالص اسلامی اخلاق اور حقیقی اسلامی تمدن سے لذت آٹن ہونے کا بھی موقع ملا ہی نہیں۔ گذشتہ زمانہ میں مسلمان پادشاہوں نے مسلمان امراء نے مسلمان حکام اور اہل کاروں اور سپاہیوں نے مسلمان زمینداروں اور رئیسوں نے اور مسلمان عوام نے اپنے بڑاؤ سے اسلام کا جو نمونہ پیش کیا وہ ہر گز ایمان نہ تھا کہ اس ملک کے عام باشندوں کو اسلام کا گرویدہ بنا سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس نفی اعراف کے لیے جو کشمکش ان کے اور غیر مسلم عناصر کے درمیان مدینہائے دراز تک برپا ہوتی رہی اس نے اسلام کے نمائندہ مستقل تاریخی تعصبات پیدا کر دیے۔

اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اسلام کا جو نمونہ آج اس زمانہ میں مسلمان اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی طریق کار سے پیش کر رہے ہیں وہ کبھی کبھار ایسا خوبصورت نہیں ہے کہ اس قسم کے نمونہ کو دیکھ کر لوگ اس تحریک کے عاشق ہو جائیں جس کی مانند ہی اس زمانہ سے گزرتی ہو۔ انفرادی زندگی میں ایک عام مسلمان ان ایک عام غیر مسلم سے آخر کس چیز میں برتر نظر آتا ہے کہ لوگ اس برتری کے منہج کی جستجو کریں؟ اس کے بڑاؤ میں، اس کے اخلاق میں، اس کے معاملات میں کہ ان کوئی مختلف سی چمک بھی ایسی نمودار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ شخص فائق تر اور پاکیزہ تر اصولوں کی پیروی کرتا ہے کہ ایک مسلمان زمیندار یا شریف صوفی یا کمبختوں کے مقابلہ میں اپنے بلند کے کسی غیر مسلم شریف یا رئیس سے کچھ کم نفوذ ہوتا ہے یا ایک مسلمان تاجر یا پیشہ ور آدمی اپنے ہم پیشہ غیر مسلم سے کچھ زیادہ متدین ہوتا ہے یا ایک مسلمان حاکم یا عہدیدار اپنے انتہائی رات کے استعمال میں کسی غیر مسلم سے کچھ بہتر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتا



ہے، کیا دفتروں کے مسلمان ملازم رات دن انہی تمام ذیل طریقوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں جن کی پیروی ان کے غیر مسلم ساتھی کرتے ہیں؟ کیا وہی جائز و ناجائز طریقوں سے اپنی قوم کا تعصب، وہی کمینہ چالوں سے غیر قوم والوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرنا، اور انہی چھوٹی چھوٹی ذمیوی اغراض کے پیچھے لڑے مرنا، جس کی تکلیف یہ غیر مسلموں سے کرتے ہیں، خود ان کا بھی رات دن کا مشغلہ نہیں ہے؟ پھر جب ایک غیر مسلم اسلام کے ان نمائندوں کی زندگی میں کہیں بھی کوئی فوقیت کا نشان نہیں پاتا جب وہ انہیں بھی وہی سب کچھ کرتے دیکھتا ہے جو وہ خود کرتا ہے، اور وہ انہیں بھی انہی مقاصد کے لیے لڑتے جھگڑتے اور کشمکش کرتے دیکھتا ہے جن کے لیے وہ خود لڑتا، جھگڑتا اور کشمکش کرتا ہے، تو آخر کوئی چیز اس کو اس مسلک کی طرف مائل کر سکتی ہے جس کی نمائندگی یہ لوگ کر رہے ہیں؟ بلکہ جب ایک ہی نفسانیت اور دنیا پرستی کے میدان میں، وہ اور یہ برابر کے حریف ہیں تو اپنے حریفوں کے مسلک پر وہ کھلے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کرنے لگا؟ ایک طرف پچھلے تاریخی تعصبات، اور پھر آج کی نفسانی کشمکش، کیا یہ دونوں چیزیں اس کے دل کے دروازوں پر قفل چڑھانے کے لیے کافی نہیں ہیں؟

انفرادی زندگی سے وسیع تر، قومی دائرے میں مسلمان اس وقت تک جس پالیسی پر مہم ہیں، بلکہ جسے اپنی حیاتی اجتماعی کا ضامن سمجھ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اصول اسلام اور مقاصد اسلام کا کہیں نام تک نہیں آتا۔ کسی خطبے کسی تقریر، کسی ریڈیویشن میں آپ ایک فقرہ تک ایسا نہیں پاسکتے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ لوگ اپنی اغراض اور اپنے دنیوی مقاصد کے لیے نہیں بند انسانوں کی فلاح کے لیے عالمگیر کلی اصولوں کے کراٹھے ہیں اور ان کی لڑائی محض اصول حق کی خاطر ہے۔ اس کے برعکس آپ یہ دیکھیں گے کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان بالکل برابر کی قوم پرستانہ جنگ برپا ہے، دونوں ایک سطح پر تڑپ رہے ہیں، ایک ہی مرتبہ کی دنیوی اغراض کے لیے کشمکش کر رہے ہیں، ایک ہی قسم کی چالیں (Tactics) زبان، اصطلاحات اور اصول نزاع اختیار کر رہے ہیں، اور سارا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا انہی چیزوں کے لیے جس کے لیے ان حریفوں کا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا ہے۔ یہ کچھ طرح کی بات عقل میں آ سکتی ہو کہ جن لوگوں آپ نے یہی غرض کے لیے مساوی تہیہ پر لڑ رہے ہوں جن آپ قابت اور جریہ کا پرانا اور تازہ رشتہ رکھتے ہوں جن کے ساتھ آپ کی سیاسی اور معاشی مفاد کے لیے



کشکش برپا ہو، وہ آپ کی طرف سے کسی اصولی تحریک کی دعوت پر اسی طرح کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں گے جس طرح وہ انٹر اکیٹ یا ڈیموکریسی یا کسی اور مسلک کی دعوت کے لیے تیار ہوتے ہیں؟

یہ تعصبات اسلام کے راستے میں دوسری عظیم الشان رکاوٹ ہیں، مگر ان کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم ان تعصبات کی پیدائش کے سبب کو باقی رکھیں اور پھر ان کی موجودگی کو بہانہ بنا کر اپنے مقصد کی طرف براہ راست پیش قدمی کرنے سے منہ موڑیں، بلکہ ان کا اصلی علاج یہ ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی طرز عمل کو بدلیں اور اس طرح تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے یہ ہمارا راستہ تیار کریں۔ جو لوگ محض سرسری نگاہ میں یہ دیکھ کر کہ اسلام کے خلاف ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، تمام قوموں میں سخت تعصبات پھیلے ہوئے ہیں، یہ فیصدہ سادر کر دیتے ہیں کہ اس حالت میں اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں بھیل سکتا، وہ دراصل واقعات کو غلط رنگ میں دیکھنے اور غلط نتائج نکالتے ہیں جیسا کہ میں نے اوپر ثابت کیا ہے، یہ تعصبات اسلام اور اسلامی سیرت کے بھڑکائے ہوئے نہیں ہیں جس سے ان قوموں کو ہندوستان میں کم ہی سابقہ پیش آیا ہے، بلکہ اسلام کے ان غلط نمائندوں کی روش سے پیدا ہوئے ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود غیر اسلامی طریقوں پر چلتے رہے اور خالصتہً اللہ کا نام کہنے کے بجائے اپنی دنیوی <sup>فصل</sup> اور نفسانی خواہشات کے لیے کام کرتے رہے۔ لہذا ان تعصبات کے تدارک کی صحیح صورت یہ ہے کہ اب اپنی سیرت، اپنے اعمال اور اپنی اجتماعی جدوجہد سے اسلام کی صحیح نمائندگی کیجیے، نہ یہ کہ تعصبات کی موجودگی کو اسی غلط روش پر چلنے کے لیے حجت بنائے جس کی وجہ سے تعصبات پیدا ہوئے ہیں۔ مانفرض اگر یہ ان لیا جائے کہ قومی تعصبات کی موجودگی میں اسلام کا ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے جلتا محال ہے، تو سوال یہ ہے کہ اسذمی مقاصد کے بجائے مسلمانوں کے دنیوی مفاد کے لیے جو کشکش آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان برپا ہے اور ان کے قوم پرست نہایتوں کے جواب میں ویسے ہی قوم پرستانہ طریقے جس طرح آپ اختیار کر رہے ہیں کیا اس سے یہ تعصبات کبھی قیامت تک بھی دور ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو پتہ نہ کہتے کہ اس وقت کچھ خاص حالات ایسے ہیں جن کی وجہ سے اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، بلکہ یوں فرماتے کہ آئندہ بھی ہمیشہ ایسے ہی حالات موجود رہیں گے اور اگر اسلام آپ ہی ذریعہ



آبائی بنارہا تو وہ ہمیشہ بڑا اسرائیل کی طرح محض آپ کو ہی مذہب بن کر رہے گا، کبھی ایک عالمگیر دعوت نہ بن سکے گا۔  
یہ انسانی نظرت کا اقتضار ہے کہ خود غرضی کے جواب میں خود غرضی اور قوم پرستی کے جواب میں قوم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے بے غرضانہ حق پرستی کے مقابلہ میں تمام تعصبات اور تمام منافقانہ جذبات آخر کار تھیا رڈال دیتے ہیں اور ایک سچے بے لوث حق پرست آگے انسان عقیدت و محبت کے بسوا کوئی اور چیز پیش کرنے پر قادر ہی نہیں رہتا۔  
اگر مسلمان اپنی وہی حیثیت قائم رکھتے جو دراصل ان کی کھٹی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان میں ان کے خلاف وہ تعصبات پائے جاتے جن کی آج شکایت کی باقی ہے۔ لیکن انھوں نے خود اپنی وہ حیثیت کھودی۔ دنیوی فائدوں کے لیے دوسری قوموں سے لڑنے چھوڑنے لگے، اور اصول حق کے سبائے اپنی اغراض ذاتی و قومی کو انھوں نے اپنی جدوجہد کا محور بنالیا۔ اس کے جواب میں اگر دوسروں کے اندر تعصب نہ پیدا ہوتا تو محجب کی بات تھی۔ جن اصولوں کا آپ نام لیتے ہیں ان کی آپ خویر وی نہیں کرتے بلکہ ان دن اپنے شخصی اور اجتماعی زندگی میں ان کے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں جس مقصد مالی کا آپ ظہار کرتے ہیں، آپ کی عملی جدوجہد اس مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ آپ کے افراد انفرادی طور پر اور آپ کی پوری جماعت بحیثیت مجموعی اس کو پس پشت ڈال کر دوسرے مقاصد کے پیچھے چلی جا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر اپنے خیالی نصب العین اور انہی مخفی زبانی اصولوں کے لیے آپ کا اسل دوسروں پر کارگر نہ ہو، اگر وہ اس اسل میں آپ کو جھوٹا سمجھیں اور آپ کی تبلیغ کو محض خود غرضانہ چال سمجھ کر حدارت سے رد کر دیں، تو آخر اس میں حیرت کی بات سی کونسی ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شریعہ کے ۱۴ یا ۲۴ نکات پر تو ایمان نہیں لاسکتا۔ نہ مسلم لیگ یا مجلس احرار جمہیت علماء کے رینویشنوں میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر کوئی ایمان لائے۔ ایمان اگر کوئی لاسکتا ہے تو لا الہ الا اللہ پر لاسکتا ہے بشرطیکہ ایک جماعت ایسی کلمہ کے لیے بیٹھنے اور اسی پر مرنے والی اس کے سامنے موجود ہو۔ مگر وہ ہے کہاں؟ کونسی جماعت آپ کے اندر ایسی موجود ہے جس نے ظاہر الاماعت حق کو اپنا مسلک اور خالص دین حق کے قیام کو اپنی گوشہ نشینی کا مرکز و محور بنالیا ہو؟ لوگ اسلام کی دعوت اور اس کے اصول حق کو کتابوں میں دیکھتے ہیں اور ان کے معترف ہو جاتے



ہیں۔ مگر اس اسلام پر عمل کرنے والی اور اس کے نصب العین کے لیے کام کرنے والی سوسائٹی ان کو کہیں نہیں ملتی۔ پھر وہ جائیں تو آخر کہاں جائیں؟ کیا اس سوسائٹی میں شامل ہوں جو رات دن دنیا ہی کے پیچھے مری جاتی ہے اور اپنی راستوں پر چلی جا رہی ہے جن پر غیر مسلم چلتے ہیں؟ آپ کی ایک جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ارض ہند پر انگریز کے بجائے ہندوستانی کا اقتدار قائم ہو۔ بعینہ یہی چیز ایک شخص کو غیر مسلم جماعتوں میں بھی مل جاتی ہے۔ پھر وہ آپ کے پاس کیوں آئے؟ آپ کی دوسری جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ہندو کے مقابلہ میں مسلمانوں کے دنیوی مفاد کا تحفظ کیا جائے۔ یہ چیز اس کو خود اپنی قوم پرستی کی مد مقابل نظر آتی ہے۔ پھر وہ اپنی قوم پرستی کو چھوڑ کر آپ کی قوم پرستی پر کیوں ایمان لائے؟ انسان کو غیر اللہ کے تسلط سے آزاد کرنے والی جماعت آپ میں ہے کہاں کہ کوئی اس کے اصول و مقاصد پر ایمان لائے اور اس میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھے!

**تیسری شکل** | سب سے بڑی گتھی جو ہمارے سوچنے والے دماغوں کے لیے ناقابل حل بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کروڑوں کی تعداد میں ایک ایسی قوم بستی ہے جو نہ پوری مسلمان ہے نہ پوری غیر مسلم۔ اس قوم کے اس حال میں یہاں موجود ہونے سے متعدد پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کا کوئی حل لوگوں کو نہیں ملتا اور اسی وجہ سے رہنما اور کارکن سب پرانگندہ عمل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں ان چند بڑی بڑی الجھنوں کی طرف اشارہ کروں گا جو اس صورت حال نے پیدا کر دی ہیں۔ بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھاکر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیاء Revival

نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے۔ یعنی یہ قوم جو مسلمان کے نام سے پائی جاتی ہے، اس کو ایک زندہ اور طاقتور قوم بنانا اور برسرِ عروج لانا اس مقصود سے اور اسی کا نام اسلام کا حیا ہے۔ یہ غلط فہمی ان کو مسلم قوم پرستی کی حد تک کھینچ گئی ہے۔ جس طرح مونہے اور سارے کر کے لیے سوال ہندو قوم کے عروج کا ہے، جس طرح مسیحی کے لیے اٹالوی قوم اور تھلر کے لیے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے، اسی طرح ان مسلم قوم پرستوں کے لیے اصل سوال اس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اور جس کے ساتھ ان کی قسمتیں وابستہ ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت میں کو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم و قطع نظر اس سے کہ وہ تعلیم کسی ہی میں، ان کی معاشی خوش حالی (خواہ وہ کسی قسم کے ذرائع سے حاصل ہو) اور ان کی



سیاسی و عسکری تنظیم (مجر و قوتی تنظیم) پر اپنا زور صرف کیا جائے، اور ان کو ایک زبردست قوم بنا دیا جائے۔ پھر یہ ان کا مقصد قرار پایا تو انھوں نے معاملات کو اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ کونسی تدبیر اس مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہو سکتی ہے، اور جو تدبیریں بھی ان کو دنیا میں قومی عروج کے لیے مفید و کار نظر آئیں ان کو بے شک انھوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا خواہ وہ اسلام سے ان کو کتنی ہی دورے جانے والی ہوں۔ یہ ذہنیت سرسبز حیدر خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مسلط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جا رہا ہے مسلمانوں کے لیے سوچا جا رہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جا رہا ہے۔

کچھ دوسرے لوگ اسلام اور مسلمان کو اس حیثیت سے تو خط ملا نہیں کرتے، لیکن ایک دوسری حیثیت وہ اسلام کے متقبل کو موجودہ نسلی مسلمانوں کے دامن سے باندھ دیتے ہیں تو وہ چاہتے تو اسلام ہی کہہ رہے ہیں، مگر ان کو خیال یہ ہے کہ اسلام کا حیا و توقوف ہے ان سب مسلمانوں کے مثل مسلمان بن جانے پر جو اس وقت قومی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ سارے کے سارے مسلمان ذہنی، اخلاقی اور عملی حیثیت سے تبدیل نہ ہو جائیں قدم آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔ اور یہ چیز جو مکہ خزانہ شواربکہ محال نظر آتی ہے، اس لیے یہ لوگ اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے ادھر ادھر کے فضول کاموں میں مختلف بنیادی مقاصد کے پیچھے اپنی قومیں ضائع کر رہے ہیں۔

کچھ اور لوگ ہیں جن کے سامنے اسلامی نصب العین قریب قریب بالکل واضح ہو چکا ہے اور وہ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں، مگر یہ سوال ان کو بار بار پریشان کرتا ہے کہ اگر ہمارے کارفرما دماغ اور کارکن ہاتھ پرکے سب اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے میں لگ جائیں تو آخر موجودہ کافرانہ نظام تمدن و سیاست اور اس کے آئندہ تغیرات میں ہماری قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کا کیا شہر ہو گا۔ اس سوال کی اہمیت ان کی نگاہ میں اتنی زیادہ ہے کہ وہ اپنے عزم و غور کو منقوی کر کے کہتے ہیں کہ پہلے اس سوال کو حل کیا جائے اور اصل مقصد کی طرف قدم اس وقت بڑھایا جائے جب اپنی قوم کا کوئی مسئلہ ہمارے لیے حل طلب باقی نہ رہے۔

لیکن یہ تمام اچھینیں غیر اسلامی طرز فکر اور غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ اگر خالص مسلمان ہونے کی حیثیت سے







"نسلی مسلمان" اصلی مسلمان نہ بن جائیں گے قدم آگے نہ بڑھایا جائے گا یہ بھی نہیں۔ کیا آپ نے "نسلی مسلمانوں" کے دنیوی مسائل کو حل کرنے تک اقامتِ دین کی کوششوں کو ملتوی رکھا تھا؟ یہ بھی نہیں۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ آپ نے تمام معاملات اور تمام مسائل سے قطع نظر کر کے "نسلی مسلمانوں" اور غیر مسلموں، سب کو خالص اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دی، جس نے اسے قبول کیا اور غیر اللہ کی بندگی و اطاعت ترک کر دی اُسے اپنے جتنے مسائل کر لیا اور پھر ان لوگوں کو لے کر الہی نظامِ اطاعت یعنی دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے براہِ راست جدوجہد شروع کر دی یہاں تک کہ اس کو قائم کر کے چھوڑا۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جس کی پیروی کو میں حق سمجھتا ہوں، اسی کی پیروی خود کرنا چاہتا ہوں، اور اسی کا مشورہ ان سب لوگوں کو دیتا ہوں جن کا نصب العین اسلامی ہے۔



# اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے

اس مقالہ میں مجھے اس عمل (Process) کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام باز پچھلے اطفال بنا ہوا ہے۔ مختلف خلقوں سے اس تصور اور اس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن پر وہاں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعہ سے امریکہ تک پہنچنا۔ اس خام خیالی Loose-thinking کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو، مگر خالص علمی (Scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے، اور نہ یہ طے کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ قائم کیونکر ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریقہ پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

## نظام حکومت کا طبعی ارتقار

جو لوگ اجتماعیات میں کچھ بھی نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کر تی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر ادھر سے راکر اس کو کسی جگہ جمادیا جائے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے شعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Pre-requisites)، کچھ اجتماعی حرکات، کچھ فطری مقصدیات ہوتے ہیں جن کے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوا کرتا ہے جس طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیاوی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشتش رکھنے والے اجزاء کے مخصوص طریقہ پر بننے ہی سے برآمد ہوتا ہے۔ اسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ



ایک حکومت صرف ان حالات کے اقتضار کا نتیجہ ہوتی ہے جو سوسائٹی میں بہم ہو گئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکل ان حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اس کی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی نوعیت کے ہوں اور ان کی ترتیب کے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیسیا ہی اجزاء کسی خاصیت کے ہوں اور ان کو جانے سے مرکب کسی اور مرکب بن جائے، درخت لیموں کا لگا یا جائے اور نشوونما یا کروہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، ان کے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما کے لیے مناسب ہو، مگر انتظامی مراحل سے گزر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہی اسباب اور اسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں حیرت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر دراصل میں یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو، اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرز عمل اختیار کرنا بہر حال ناگزیر ہے۔ اس کے لیے غور و فکر کی یہی تحریک اٹھے، اسی قسم کے انفرادی کیرکٹرنیا رہوں، اسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے، اسی طرز کی لیڈر شپ ہو اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضار اس خاص نظام حکومت کی نوعیت فترۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد کرنے سے ان کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی تیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھرتا ہے جس کے لیے ان حالتوں اسباب نے جدوجہد کی ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک خاص حد پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہو جاتے ہیں جن کے لیے اس کی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کریں تو آپ کو یہ تسلیم کرنے میں دیر نال نہ ہو گا کہ جہاں تحریک، لیڈر شپ، انفرادی بہت، جماعتی اخلاق اور حکمت عملی، ایک



چیز ایک نوعیت کا نظام حکومت پیدا کرنے کے لیے توزون و مناسب ہو، اور امید یہ لی جائے کہ اُن کے نتیجہ میں بالکل  
 ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہوگا۔ زبان سے تعویذ، خام خیالی اور خام کاری کے سوا کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

## اصولی حکومت

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ حکومت جس کو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں، کس کی نوعیت کی ہے۔ اس مسئلہ میں

سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر

اس میں قہری نہیں ہے۔ دوسرا ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں اس کو *Ideological State* (ایڈیولاجی) کہتے ہیں۔

یہ اصولی حکومت وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآئینہ رہی ہے اور آج تک ناآئینہ ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ نہ فائدہ تو

یا طبقوں کی حکومت واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ محض ایک اصولی حکومت، اس

بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرے وہ ساری قومیت اس پر اوجھڑنے میں حصہ درہوگا۔ دین کے تنگ دھن میں کبھی

نہ سواسی۔ عیسائیت اس تخیل کی بنیاد پر ہے۔ دوسرا اس نقش پایا، مگر اس کو وہ مکمل نظام فکر نہ مل سکا جس کی بنیاد پر کوئی

استیلا قائم ہو سکتا۔ انقلاب فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذرا سی جھلک ان کی نظر کے سامنے آئی مگر شیعہ

کی ناریں میں نہ ہو سکی۔ آئندہ آئندہ اس میں کا ڈا سا چرچا کیا جاتی ہے کہ ایک حکومت بھی اس کی بنیاد پر قائم کرنے کی کوشش

کی جائے گی۔ وہ سب سے دیکھا کہ کچھ میں کچھ تخیل کو جو کچھ کے دو اہل میں سے ایک میں بھی سحر و جادو نہیں ہے۔ بس

سے سب سے پہلا اس صورت میں ہے کہ اس کی حکومت ہے۔ اس کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد

اس کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد

اس کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد

اس کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد

اس کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد

اس کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد

اس کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد اس کے اصول کے بعد



جن کی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمام حکومت آئی تو ان کو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت (National State) کے سوانہ سوچھا کیونکہ وہ اسلام کے علم و شعور اور اصولی حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھے۔ ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے اس طرز کی دماغی تربیت پائی ہے وہ اسی شکل میں مبتلا ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام جتنے ہیں مگر بچارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ ہر جگہ جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرز فکر (Nationalistic Ideology) ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں، اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک پیش نظر مسئلہ کی نوعیت پس یہ ہے کہ مسلمان کے نام سے جو ایک قوم بن گئی ہے اس کے ہاتھ میں حکومت آجائے یا کم از کم اس کو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے یہ جتنا بھی دماغ پر زور ڈالتے ہیں اس کے سوا کوئی طریقہ کار انھیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قویں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لیے بھی اختیار کی جائیں۔ جن اجزاء سے یہ قوم مرکب ہے ان کو جوڑ کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے، ان میں مثیلزم کا جوش پھونکا جائے، ان کے اندر مرکزی اقتدار ہو، ان کے نیشنل گارڈس منظم ہوں، ان کی ایک قومی ملیشیا بنائی جائے، وہ جہاں اکثریت میں ہوں وہاں اقتدار اکثریت (Majority-rule) کے مسلم جمہوری اصول پر ان کے قومی اسٹیٹ بن جائیں، اور جہاں ان کی تعداد کم ہو وہاں ان کے حقوق کا تحفظ ہو جائے، ان کی انفرادیت اسی طرح محفوظ ہو جس طرح دنیا کے ہر ملک میں ہر قومی اقلیت (National Minority) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی و انتظامی ادارات میں ان کا حصہ مقرر ہو، اپنے نمائندے یہ خود چنیں، وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کے جائیں، وغیرہ ذلک من القومیات۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امت، جماعت، ملت، ملیت، امیر، اطاعت امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لے کر بولتے ہیں، مگر اسی فکر کے اعتبار سے یہ بولتے ہیں کہ یہ مذہب قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑائے بل گئے اور غیر اسلامی رنگ کے لیے اسلامی رنگ کے خلاف کام دینے لگے۔



اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپ کو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئے گی کہ اس کی بنا رکھنے کے لیے یہ طرز فکر، یہ انداز تحریک، یہ عملی پروگرام نقطہ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کا ہر جز ایک تیشہ ہے جس سے اصولی حکومت کی جڑکٹ جاتی ہے۔ اصولی حکومت کی تخیل کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں، صرف انسان ہیں۔ ہم ان کے سامنے ایک اصول اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اسی پر تمدن کا نظام اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں ان کی فلاح ہے اور جو اس کو قبول کرے وہ اس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ غور کیجیے، اس تخیل کو لے کر وہ شخص کس طرح اٹھ سکتا ہے جس کے دماغ، زبان، افعال و حرکات، ہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپا لگا ہوا ہو۔ اس نے تو وسیع تر انسانیت کو اپیل کرنے کا دروازہ خود ہی بند کر دیا، پیسے ہی قدم پر اپنی پوزیشن کو آپ غلط کر کے رکھ دیا۔ قوم پرستی کے تعصب میں جو قومیں اندھی ہو رہی ہیں، جن کے لڑائی جھگڑوں کی ساری بنیاد ہی قوم پرستی اور قومی ریاستیں ہیں، ان کو انسانیت کے نام پر پکارنے اور انسانی فلاح کے اصول کی طرف بلائے کا آخریہ کونسا ڈھنگ ہے کہ ہم خود اپنے قومی حقوق کے جھگڑے اور اپنے قومی اسٹیٹ کے مطالبہ سے اس دعوت کی ابتداء کریں؟ کس طرح اب کی عقل یہ بات قبول کرتی ہے کہ مقدمہ بازی سے لوگوں کو روکنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جاسکتی ہے؟

## خلافتِ الہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا فائدہ بان باطنفہ یا قوم کو جبکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور حیثیت صحیح طور پر مذہب دو صورتوں سے قائم ہو سکتی ہے: یا تو کسی انسان کے پاس براہ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستور



حکومت آیا ہو، یا وہ، اس شخص کی پیروی اختیار کرے جس کے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہوں گے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اس کی پیروی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائے گا کہ ہم سب بہ حقیقت مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جس کے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی۔ اور جس کی گرفت سے ہم مگر بھی نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، ان کو اپنا غلام بنائیں، ان کے سر اپنے آگے جھکوائیں، ان سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حالانکہ اختیارات سے کام لے کر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبر پائی کا سامان کریں، بلکہ یہ سزا بار ہم پر اس ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانون عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی پابندی اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی، نفس پرستی، تعصب، جانبداری یا بددیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائیں گے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کی ترکیب، اس کا مزاج، اس کی فطرت، کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت، اور خاص نوعیت کی ادارہ کی ضرورت ہے۔ اس کی فوج، اس کی پولیس، اس کی عدالت، اس کے مالیات، اس کے قوانین، اس کے محاصل، اس کی انتظامی پالیسی، اس کی خارجی سیاست، اس کی صلح و جنگ کے معاملات، اس کے سب دنیوی رہائشوں سے مختلف ہیں۔ ان کی عدالتوں کے جج اور چیف جسٹس اس کی عدالت کلرک بلکہ چیر اسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ان کی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانٹبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھہرتے۔ ان کے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ ان کے وزراء خارجہ وہاں کسی منصب پر تو کیا مقرر ہوں گے، شاید اپنے جھوٹ، دغا اور بددیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو ان حکومتوں



کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں۔ جن کی اخلاقی و ذہنی تربیت ان کے مزاج کے مناسب حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ ہیں۔ اُس کو اپنے شہری، اپنے دوڑ، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور ججٹ، اپنے محکموں کے ڈائریکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفر اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے، بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں، جنکی نگاہ میں خلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو، جو برہان میں اُس ضابطہ اور اس طرز عمل سے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنادیا گیا ہے، جن کی تمام سعی و جہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مستطاف نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشہ میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے حربوں اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں، جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے اُن کے دست قدرت میں آئیں تو وہ پگے امانت دار ثابت ہوں جب بستیوں کی حکومت ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ ان کی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سب سے خوف رہیں جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل و غارتگری، ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کو کوئی اندیشہ نہ ہو بلکہ اُن کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عزتوں کی عصمت کا محافظ بن جائیں، جن کی دھماک میں الا قوامی ریاست میں اس درجہ کی ہو کہ اُن کی راستی، انصاف پسندی، اصول اخلاق کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے۔

انہی ہی لوگ اس کو چلا سکتے ہیں۔ رہے مادہ پرست، افادی ذہنیہ، **Utilitarian Mentality** رکھنے والے لوگ جو دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جن کے پیڑ نقد خدا ہو۔ آخرت، بلکہ جن کی ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا دار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا خیال ہو، وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے قابل تو کہا ہوں گے، اُن کا اس حکومت کے دائرے میں نہ وجود ہونا ہی ایک عمارت



میں دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

## اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی کیا سبیل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتداء میں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائٹی میں جس قسم کے فکری، اخلاقی، تمدنی اسباب و محرکات فراہم ہوتے ہیں، ان کے لغات سے اسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونیل سے لے کر پورا درخت بننے تک توہمیوں کی حیثیت نشوونما پائے، مگر بار آوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ حقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتداء میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریہ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین مالیات و معاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں جن میں یہ قابلیت ہو کہ انکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک کتل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے نافذ خناس ائمہ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellectual Leadership) کا سنگہ جمادیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر سختیاں جھیل کر قربانیاں کر کے، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو ہر رکھنے والا ہر طرح سے جان بچ کر بے کھوٹ



کامل البیاد سونا ہی پائے۔ اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اٹھتے ہیں۔ اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث، بے غرض، راستباز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے، اس تحریک میں کھینچ آئیں گے بہت سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اس کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی، اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائے گا جس کے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہو، اور جو نہیں کہ وہ نظام قائم ہوگا، اس کو چیلانے کے لیے ابتدائی اہل کاروں سے لے کر وزراء اور نظماز تک ہر درجہ کے مناسب کل پُرزے اس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہوں گے جس کا ذکر ابھی کر چکا ہوں۔

یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک فاضل نوعیت کا انقلاب اسی نوعیت کی تحریک، اسی نوعیت کے بے راہ کار کن اور اسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلاب فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اس درکار تھی جو روس، ویتنام اور مونٹسکیو جیسے بیڈروں نے تیر کی۔ انقلاب روس صرف مارکس کے افکار اور لینن اور ٹروٹسکی کی بی طرفی اور ان پر رہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جن کی زندگیوں میں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل جاتی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اس مخصوص اخلاقی و تمدنی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جو میل، فتنے، کیوتھے، نیشے، اور بہت مغربین کے غم بات اور بددیانتی نے بنا لیا۔ اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جب کہ ایک عمومی تحریک قرآنی غائی



و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری ذہنی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاق طور جدوجہد سے بدل ڈالے۔ یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ نوعیت کی کوئی تحریک جس کا پس منظر یہ ناقص نظام تعلیم ہو جو اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، اور جس کی بنیاد افادی اخلاقیات Utilitarian morals اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی انقلاب آخر کس طرح برپا کر سکتی ہے؟ میں اس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس کے سابق وزیر اعظم موریس رینولین رکھتے تھے۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ صبی تدبیر کی جاگی دیے ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

## خام خیالیاں

ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام درووں کی دعا ہے۔ "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہند" میں آزاد اسلام کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں، اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں، لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کرے گی خواہ وہ ہندو قوم ہو، یا سکھ، یا جرمن، یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو ہر قوم کی سر بلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ وہ مونچے یا ساور کر ہو یا سٹلر یا مسوینی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی غرائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ جاپانیت پر ایمان رکھتے ہوں یا چینیت پر۔ پس اگر مسلمان ایک نسلی و تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیش نظر مقصد صرف اس کا بول بالا کرنا ہے تو اس کے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک قومی حکومت بھی میسر آ سکتی ہے اور بدرجہ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصہ بھی مل سکتا ہے لیکن اسلامی

۱۹۱۹ء میں فرانس کی شکست سے چند روز پہلے موریس رینولین نے، جو اس وقت وزیر اعظم تھے، ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے

کہا تھا کہ اب فرانس کو صرف ایک معجزہ ہی بچا سکتا ہے اور میں معجزات کا قائل ہوں۔



انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ اٹا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطبے یا بس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیر کڑ کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کا فر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت خدا کے خوف سے اتنا ہی خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پا کر یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پا کر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیلوں کو جمع کر کے ایک منظم گتہ بنادینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لوٹری کی ہشیا، سی سکھانا یا فوجی تربیت ان میں بھڑپے کی زندگی پیدا کرنا جنگل کی فرماں روائی حاصل کرنے کے لیے تو مفید ہو سکتا ہے، مگر میں سمجھتا کہ اس سے اعلا کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون ان کی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا؟ کس کی نچاں میں ان کے سامنے عزت سے جھکیں گی؟ کس کے دل میں انھیں دیکھ کر اسلام کے بے جذبہ احترام پیدا ہوگا؟ کہاں ان کے انفاہ قدسیہ سے یدِ خلون فی حبیب اللہ انوَجراً کا منظر دکھائی دے سکے گا؟ کس جگہ ان کی روحانی امامت کا سکھ جے گا؟ اور زمین پر بسنے والے کہاں ان کا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کریں گے؟ اعلائے کلمۃ الحق جس چیز کا نام ہے اس کے لیے تو عرف ان کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر فائدہ و نقصان کی پروا کیے بغیر جنے والے ہوں۔ خواہ وہ اس نسل مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اس کے کہ وہ نبوہ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں ۲۵ لاکھ یا ۵۰ لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے۔ اس دم کوتاہی کے ان سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا یا گیا ہو۔ وہ سکے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک ان



جعلی اشرافیوں کے ڈھیر سے اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔ پھر جس لیڈر شپ کی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ضرورت ہے وہ ایسی لیڈر شپ ہے جو ان اصولوں سے ایک ایچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو جن کا بول بالا کرنے کے لیے اسلام اٹھا ہے، خواہ اس بہت کی بدولت تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مر جائیں بلکہ نہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیے جائیں۔ ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی اور اصول سے بے نیاز ہو کر ہر اس تدبیر کو جس میں قوم کی دنیوی فلاح نظر آئے، اختیار کر لینے والی لیڈر شپ اور وہ لیڈر شپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو، اس مقصد کے لیے قطعی ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔

پھر وہ نظام تعلیم و تربیت جس کی بنیاد اس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے کہ چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی، اس اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا قطعی ناقابل ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ ہوا خواہ کسی طرف کی ہو، تم بہر حال اس راستہ پر چلو جو خدا نے تمہارے لیے معین کر دیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر آپ کو ایک خطہ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اسلامی اصول پر اس کا انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکیں گے۔ اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مالگزاری، فینانس، تعلیمات، اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے ان کو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپ نے نہیں کیا ہے۔ یہ تعلیم حجاب کے کالجوں میں دی جا رہی ہے، غیر اسلامی حکومت کے لیے سیکریٹری اور وزیر اعلیٰ فراہم کر سکتی ہے، مگر براہ مایہ، اسلامی عدالت کے لیے چیپراسی اور اسلامی پولیس کے لیے کانسٹیبل تک فراہم نہیں کر سکتی۔ اور یہ بات جدید تعلیم ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہمارا وہ پرانا نظام تعلیم جو حرکت زمین کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، وہ بھی اس معاملہ میں اتنا ناکارہ ہے کہ اس دور جدید میں اسلامی حکومت کے لیے ایک قاضی، ایک وزیر مال، ایک وزیر جنگ، ایک ناظم تعلیمات اور ایک سفیر بھی نہیں کر سکتا۔ اس تیاری پر اسلامی حکومت کا حوصلہ! سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ یہ نام زبان پر لاتے ہیں ان کے ذہن اسلامی حکومت کے صحیح تصور سے خالی ہیں۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے



پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، حکومت نظام ختمی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ عمر ابن عبدالعزیز جیسا فرماں روا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے، کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تعلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ یامون الرشید جیسا باجبروت حکمران نظام حکومت میں نہیں صرف اس کی اوپری کل میں خفیف سی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں کبھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جب کہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر قائم ہو گا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیرکٹر کے حامل نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور لے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو ان کے ووٹوں سے کبھی مسلمان "قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شمار سی کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی موافقی نہ ملے گی اور اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ قومی حکومت ہے جس پر اسلام کا نام لیا گیا ہو، لہذا اس کو استروکے میں اس سے بھی زیادہ جبری و بے باب ہو کر اپنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کا ہول پر مید کی سنہ ادیتی سے، وہ



"مسلم قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلا وطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کی سزا جیتے جی غازی اور مرنے پر جتنا اللہ علیہ ہی رہیں گے پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی قومی حکومت "کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی اور اگر نہیں یہ کام حکومت کی امداد کے بغیر بلکہ اس کی فراہمیت باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اس نام نہاد "مسلم حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے نظام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدا راہ ثابت ہوگی؟

## اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار

اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعے سے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور از سر نو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریق کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

اسلام دراصل اس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اس کے پیڑروہ لوگ تھے جن کو رسول اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو احوال انہی پیڑروہ کے طرز عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اس کے ہوا کوئی اور طرز عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گزرے ہیں ان کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل سکیم نہیں بن سکتی۔ بائبل کے عہد جدید (New Testament) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی



تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے عاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نوری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے لٹیف فراز معلوم کرنے کے لیے اسی طرف رجوع کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تئیں یہ اصولوں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظم و منکبت کے پنج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہذا میں اسی ماحذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حبیبِ اسلام کی دعوت پر ہمارے جوئے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ابن عربی ایسے ہی مجاہدین تھے۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز موشی انتفاع Economic Exploitation بھی ہو رہا تھا اور اخلاقی ذمہ داری بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے تو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، اندلس طوائف الملکی، اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ میں تکبر کے تمام ساحلی علاقے، عراق کے رخیز، صوبے سمیت ایرانی آلمن میں تھے۔ شمال میں چین جہاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود جہاز میں یہودی ایہ وادیوں کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوئے تھے اور انھوں نے عربوں کو یہی سود خواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عیسائی حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکا تھا۔ اس ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتنا خود جہاز اور یمن کے درمیان خواران کے نظام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے



اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الہوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی ایک الہ کی بندگی قبول کرو۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے

لائق ہی نہ تھے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ آگے چل کر اس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور سب کو ایک ایک

کر کے حل کیا۔ مگر ابتدا میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی

تحریک کے نقطہ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علت

انسان کا اپنے آپ کو خود مختار *Independent* اور غیر ذمہ دار *Irresponsible* سمجھنا، بالفاظ دیگر آپ

اپنا الہ بننا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ الہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحب تسلیم کرے خواہ وہ دوسرا کوئی انسان

ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رو سے کوئی ادبیری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی

خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائے گا اور کسی دوسری طرف سے وہ

سرنکال لے گی۔ لہذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ

سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی <sup>سلطنت</sup>

نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے نہ

تیرے بٹلے سے مرٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حدود و سلطنت سے نکل کر کہیں جاسکتا ہے۔ اس اہم اور اہل

واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک حرقہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیری

ہی اوپر عائد ہوگا عقل اور حقیقت پسندی *Realism* کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اس کے حکم کے آگے سر

جھکا دے اور مطیع بندہ بن کر رہ دو۔ دوسری طرف اس واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھایا جائے کہ اس پوری کائنات میں

صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختار کار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور

نہ واقع میں کسی کا حکم چلتا ہے۔ اس لیے تو اس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن کسی کا حکم نہ مان۔ کسی کے آگے سر نہ جھکا۔



یہاں کوئی ہر ہائینس نہیں ہے۔ ہائی نس صرف ایک ہی کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہر مولی نس نہیں ہے۔ ہائی نس ساری کی ساری اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہر لارڈ شپ نہیں ہے۔ راجہ شپ: کلیہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law giver) نہیں ہے۔ قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنائے گا حق دار و منراور ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان دتا، کوئی ولی و کار، کوئی دعائیں سننے والا اور فریادہ من نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے اور اسی ایک کا غلام، مطیع اور پابند حکم بن جاتا۔ یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھڑ کر از سر نو ایک نئے نقشے پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقہ سے حل ہوتے ہیں۔

محمد علی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہ راست پیش کر دیا۔ انھوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی سیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا موثبات طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے پھر اس اثر سے کام لے کر کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو حیداتے ہوئے اس مقام تک لے آئیں، یہ سب کچھ کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا، اور چھوٹے ہی اس نے لا الہ الا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر ایک نعمہ کے لیے بھی اس کی نظر نہ ٹھہری۔ اس کی وجہ محض پیغمبرانہ جرات اور تبلیغی جوش نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار سی ہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار خود سے ذرائع سے پیدا کیا جائے اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں۔ جو لوگ لا الہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہیں وہ اس بنیاد پر تمیز پیدا کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں



جو آپ کی طرف لا الہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں، اسی چیز میں ان کے لیے کشمکش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں۔ اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں۔ لہذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبیر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا ہی یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اسی دعوتِ توحید سے کیا جائے۔

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔ اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کو خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت والوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اُکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری ایسی پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے موزن کو اٹھد ان لا الہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوتا ہے سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرماں روا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود اختیارات (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیاز حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے مخوف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سائب، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔

یہی صورت اس وقت پیش آتی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اس لیے جس جس پہلو سے بھی اس پکار کی غرب پڑتی



تھی وہ اس کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساموکاروں کو اپنی ساموکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق Racial Superiority کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بت کے پرست کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا، اس لیے اٹھ کھڑا واحد، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک سے لڑنے سے یکے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر جان و مال میں کوئی قربانی اور موت سے کھینٹنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا، کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست، آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو پتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سہرا بازار پھردن اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑی گئی۔ کسی کا سر پھاڑا گیا۔ کسی کو عورت مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، ان کا آنا ضروری تھا، ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا یہ فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے کچے کپڑے اور ضعیف، رادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسل آدم کا بہتہ بن جو ہر قحط کی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کاہن کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ کیاں لینے کی اس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گذر کر آئے۔ پھر جو لوگ آئے ان کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مسافر کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اس کی رضا کے لیے۔ اسی کے لیے وہ اپنے اسی کے لیے مسافر کے مقابلہ میں دنیا بھر کی جفا کاریوں کا ٹھکانہ بن گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ سمجھ اسٹانی



ذہنیت پیدا ہوتی گئی جس کی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھنا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اس کی راہ میں کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلا وطنی وغیرہ کے مہملوں سے گزرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اس کی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز ان پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان دور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر ان کی نگاہ جمی رہے۔ جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اس کی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدے میں مضبوط ہو جائیں جس کے حکم کے مطابق انھیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب و الشہادہ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قاهر فوقی عبادہ ہونا پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال میں بھی اس کی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک ان کے دل میں نہ آنے پائے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں۔ تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انھیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی ان کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے، تو ان کے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اس چیز کو معلوم کریں، آخر ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انھیں معلوم ہوتا کہ وہ چیز ہے لا الہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، اور اس دعوت کے لیے لوگ اٹھتے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں تو ان کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ ان کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے



تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز ان لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت تکبر یا جہاد پرستی کی جہالت، یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھینچے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھینچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی فراہمیت کرتا رہا، مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند، بے لوث آدمی کو اس کی طرف کھینچنا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈرنے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ ان کی ہر بات، ہر فعل اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جس کی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصر اچند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کروں گا۔

ان کی بیوی حضرت خدیجہ حجازی رجب سے زیادہ مالدار عورت تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنانے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پھیلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار تھا، اس کو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے، عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دیں گے، دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیشکشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور تہمتیں لگانے پر راضی ہو گیا۔

قریش اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سنیں جبکہ



تھوڑی مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب زیادہ نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا اس نے دیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلہ، اپنے خاندان کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اُٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر مسلموں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے کبھی بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو تو کسی طرح بچالوں تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اُٹھتے تو حبش کے بلال، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مکہ سے جب آپ کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپ کے پاس کھوائی تھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک امانت اس کو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لے کر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان کے دشمنوں، اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی فکر کی اور اس وقت کی جبکہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جس کو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال بعد بدر کے میدان میں آنحضرت کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہوں گے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اُس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اُس وقت ان کے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہوں گے مگر ان کے دل اندر سے پھنچ رہے ہوں گے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔



۱۳ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے آدمی فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پا کر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اُسے کام کرنے کا موقع ملے، مسلمان کی حیثیت سے اس کو انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے، چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں ہر شعبہ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرادی۔ یہ دور اسلامی آئیڈیالوجی کے ایک مجرد تخیل Abstract Idea سے ترقی کر کے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبہ زندگی کے لیے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سائے کی مختصر مدت میں مدینہ صیے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اس کی عملی صورت میں اور اس کے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہو جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اُسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جس کے خلاف وہ لڑ رہے تھے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے، ابو جہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے، ابوسفیان قائل ہوئے، قاتل حمزہ وحشی قائل ہوئے، ہند جگر خوار تک کو آخر اس شخص کی صداقت کے آگے تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اس کی نگاہ میں کوئی مغرض نہ تھا۔ غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا حالانکہ آٹھ سال کی تمام لڑائیوں میں جن سے عرب صیسی جنگجو قوم سر ہوئی، ظہین کے جانی نقصان کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپ کے پیش نظر سے تو آپ کو تسلیم کرنا ہو گا کہ یہ انقلاب غیر خونریز انقلاب Bloodless Revolution کہے جانے کا مستحق ہے۔ پھر اس انقلاب میں نقطہ ملک کا طریق



انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائص بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے۔ جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ جو چور اور اچلے تھے ان کا احساس دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی ان کو اس بنا پر تامل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے، حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو نہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جو ڈاکو اور لٹیروں تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ ان کے ایک معمولی سپاہی کو پاپہ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروڑوں کی قیمت کا شاہی تاج ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کھیل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالے کرنے کے لیے پہنچاتا کہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اس کے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آجائے۔ وہ جن کی نگاہیں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جن کو راست بازی اور انصاف کی ہوائ تک نہ لگی تھی ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب ان کا تھیلہ یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو ایک بیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے، مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا آدھا حصہ، طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھالیں۔ اس نرالی تقسیم کے تفصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انلشت بند رہ گئے اور بے اختیار ان کی زبانوں سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے، بازاروں میں پسپل پھرتے تھے، دروازوں پر دربان نہ رکھتے تھے، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا



تھا۔ ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ کیا۔ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ ان کے اندر وہ پہلا سال پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دوران جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیرہ یہ کہراہل شہر کو واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں۔ لہذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اُسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ ان میں وہ سفیر پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے پہلا سال ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی بر محل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اسی وقت پڑ گیا ہو گا۔ ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جن کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی ان کا اقبال خود اُکرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں نمیش ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوئے جو تنخواہ لے کر نہیں پڑتے تھے بلکہ اُس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے، اپنے خرق سے میدان جنگ میں جاتے اور پھر جو مال غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا لاکر پہلا سال کے سامنے رکھ دیتے، کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذمہ داری کا اتنا زبردست تغیر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے کہیں آپ کو کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح مکمل طور پر بدل ڈالا ہو؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ۱۳ برس کی مدت میں توکل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے مگر بعد کے دس سال میں سارا کا سارا ملک مسلمان ہو گیا۔ اس معجزہ کو لوگ حل نہیں کر سکتے اس لیے عجیب عجیب توجہیں دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات بالکل صاف ہے۔ جب تک اس نئی آئند یا لوجی پر زندگی کا نقشہ نہیں بناتا تھا لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا ایڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نری نہ ہوا نہ باتیں ہیں۔ کوئی اسے محض زبان کی ساحری قرار دیتا۔ کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنون



ہو گیا ہے۔ اور کوئی اسے محض ایک خیالی آدمی (Visionary) قرار دے کر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کر دیتا۔ اُس وقت صرف غیر معمولی سمجھ اور ذہانت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جن کی نگاہ حقیقت میں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظام فکر پر ایک مکمل نظام حیات بن گیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اس کے نتائج ان کے سامنے عیاں آ گئے تب ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ چیز تھی جس کو بنانے کے لیے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سے رہا تھا۔ اس کے بعد خدا اور بڑے دھرمی کے لیے پاؤں جانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ جس کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اس کے لیے آنکھوں کی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کا راستہ ہے، اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے، اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہہ دیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہو سکتا ہے، نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ تھا۔ اس میں علت و معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج بھی ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعور، اسلامی ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوت فیصلہ، اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس لیے ان جوان بہت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اُس پر پوری طرح نظر جمادیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں، دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک اتبغ نہ ہٹیں، دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات کو قربان کر دیں، اپنی ماییدوں کا اور اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، غریزوں اور دوستوں کے چھٹ جانے کا غم نہ کریں، سوسائٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن جو چیز بھی ان کے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا، ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے، اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔



**استدراک** اوپر کے مضمون میں اسلامی انقلاب کے طریق کار کی جو توضیح کی گئی ہے، اگرچہ وہ بجائے خود کافی ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسیح علیہ السلام کے چند اقوال ایک خاص ترتیب کے ساتھ نقل کر دیے جائیں جن سے اس تحریک کے ابتدائی مرحلہ پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ ہمارے موجودہ زمانے کے حالات اُن حالات سے بہت ملتے جلتے ہیں جن میں سیدنا مسیحؑ نے اہل فلسطین کو حکومت الہیہ کی دعوت دی اس لیے اُن کے طریق عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں:-

"فقہوں میں سے ایک نے... اُس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کونسا ہے بیوع نے جواب دیا کہ

اول یہ ہے، اے اسرائیل بن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور

اپنی ساری جان اور ساری عقل اور اپنی ساری طاقت محبت رکھ... فقہ نے اس کو کہا اے استاد کیا خوب!

تو نے بیع کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں (مرقس ۱۲: ۲۸-۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (لوقا ۴: ۸)

"پس تم اس طرح دعا مانگا کرو کہ اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت

آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو" (متی ۶: ۹-۱۰)

آخری آیت میں حضرت مسیح نے اپنے نائب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی اوجھڑی روحانی بادشاہت تھی، یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے۔ ان کا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اس کا حکم شرعی اسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اس کا قانون طبعی نافذ ہے۔ اسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں

کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بھوکو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور آدمی کے دشمن

ملکہ خداوند اہل اللہ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔



اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو بچے سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور

جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اُسے کھوئے گا

اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اُسے بچائے گا۔" (متی ۱۰: ۳۴-۳۹)

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی سے انکار کرے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہوئے۔"

(متی ۱۶: ۲۴)

"بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالہ کرے گا اور بیٹے کو باپ۔ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر

انہیں مرداؤں لیں گے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک ہمت کرے گا

وہی نجات پائے گا۔" (متی ۱۰: ۲۱-۲۲)

"دیکھو میں تمہیں بھیجا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں۔۔۔۔۔ آدمیوں سے خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں

کے حوالے کر دیں اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب جاکمروں اور بادشاہوں

کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔" (۱۰: ۱۶-۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے

بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں

ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک بُرج بنا نا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب کر لے کہ آیا میرے

پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب بچکنے والے یہ کہیں

اس پر ہنسنا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عمارت شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا۔۔۔ تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک

کر اپنی صلیب اُٹھانے سے مراد نہ اسے موت کے لیے تیار رہنا ہے۔ جس طرح اردو میں محاورہ ہے مٹھلی پر لے کر نکلا۔

اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراض ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔

اسے دشمنی کرنے سے مراد ان کی محبت اور ان کے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کر دینا ہے۔







باوجود اپنی شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب حندا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل نور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہنتا ہے تو بے کم اعتقاد و اتم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ ..... تم پہلے اس کی بادشاہت اور اس کی راست بازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی۔" (متی ۶: ۲۴-۳۳)

مانگو تمہیں دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔

(متی ۷: ۷)

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے رہبانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی تھی۔ حالانکہ اس انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمل، شہداء اور توکل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظام تمدن و سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھایا ہوا ہوا اور تمام وسائل و ذرائع زندگی اس کے قبضہ و اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت انقلاب کے لیے اٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبت ل سے نکال نہ دے، سختیاں اٹھانے کو تیار نہ ہو جائے، اپنے بہت سے فولد کو قربان کرنے اور بہت سے نقصانات گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات و مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہے۔ یہ کام تمہیں کرنا ہوا نہیں بلکہ تھپڑ کھا کر دوسرے تھپڑ کے لیے تیار رہنا چاہیے، کرتا ہاتھ سے جاتا ہو تو چو غم بھی چھوڑنے کے لیے آمادہ ہونا چاہیے، اور روٹی ٹکڑے کی فکر سے آزاد ہو جانا چاہیے۔ خزان رزق فی الوقت جن کے ہاتھ میں ہیں، ظاہر ہے کہ ان سے لڑ کر رزق پانے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ لہذا جو اباب سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسہ پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو وہی ان سے لڑ سکتا ہے۔

"اے محنت اٹھانے والو! بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں آرام دوں گا۔"

میل جنٹا اپنے اوپر اٹھالو..... کوئٹہ میرا ملا ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔ (متی ۱۱: ۲۸-۳۰)



شاید حکومت الہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پُر اثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ انسان پر انسانی حکومت کا جو بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جو میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔

”غیر قوموں کے بادشاہ ان پر حکومت چلاتے ہیں۔ اور جو ان پر اختیار رکھتے ہیں وہ خداوند نعمت کہلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کے مانند اور سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کے مانند بنے۔“ (لوقا ۲۲: ۲۵-۲۶)

مسیح علیہ السلام یہ ہدایت اپنے حواریوں یعنی صحابیوں کو فرماتے تھے۔ اس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون و نمرود نہ بن جاؤ۔ ”فقہ اور فریسی موسیٰ کی گمراہی پر بیٹھے ہیں پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں اپنی ناگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دہانے کو کرتے ہیں۔ اپنے تمویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے اور ضیافتوں میں صدیقی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازیدیں میں سلام اور آدمیاں سے رتی کہلانا پسند کرتے ہیں۔“

”اے رماکار فقہ اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔“

نہ آپ داخل ہوتے ہو اندر داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔“

”اے رماکار فقہ اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور شکی کا دورہ کرتے ہو۔“

سے فریسی سے مراد حاملانِ شریعت ہیں۔











# ایک صالح جماعت کی ضرورت

دنیا میں اس وقت بڑے زور کے ساتھ توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ آتشِ اُرسِ دین  
 بِمَنْ فِی الْاَحْزَانِ اَمْ اُرَادَ یُحْمِمْ سَرْجُھُْمُ سَرَشْدًا، اہل زمین کو محض ان کے کرتوتوں کی سزا ہی دینے کا  
 ارادہ کیا گیا ہے یا اس توڑ پھوڑ کے بعد کوئی صالح چیز بھی بننے والی ہے۔ مگر ظاہر آثار سے اتنا محسوس ہوتا ہے  
 کہ نوعِ انسانی کی امامت اب تک جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے، اس کی عمر پوری ہو چکی ہے،  
 اُن کے امتحان کا زمانہ خاتمہ پرا لگا ہے، اور سنتِ اللہ کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ اُن کو اور ان  
 کی اس جاہلی تہذیب کو دنیا کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے۔ اُن کو زمین پر کام کرنے کا جتنا موقع  
 ملنا تھا، مل چکا۔ وہ اپنے تمام اوصاف، اور اپنی تمام چھپی ہوئی قابلیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ اُن کے  
 اندر شاید اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جو باہر نہ آ چکی ہو۔ لہذا غالب گمان یہی ہے کہ غنقریب میدان  
 سے ہٹائے جائے والے ہیں، اور یہ زبردست شکست و ریخت اسی لیے ہو رہی ہے کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں  
 سے اپنے مراسمِ تجنیز و تدفین ادا کر دیں۔ اس کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا میں کچھ ایک ظلمت کا دور شروع  
 ہو جس طرح آخری اسلامی تحریک کے زوال اور موجودہ جاہلی تہذیب کی پیدائش کے درمیان گزر چکا ہے، اور  
 یہ بھی ممکن ہے کہ اسی ٹوٹ پھوٹ کے دوران میں کسی نئی تعمیر کی صورت نکل آئے۔

سر یا دارانہ جمہوریت، قومی اجتماعیت (نیشنل موٹرم) اور انٹر اکیٹ (کیونٹزم) کی جو طاقتیں اس وقت  
 آپس میں متصادم ہیں، یہ دراصل الگ الگ تہذیبیں نہیں ہیں کہ ان کے درمیان انتخاب، اور ان میں سے بہتر کے  
 باقی رہنے کا کوئی سوال ہو حقیقت میں یہ ایک ہی تہذیب کی تین شاخیں ہیں۔ ایک ہی تصور کائنات، ایک ہی  
 تصور انسان، ایک ہی نظریہ حیات، اور ایک ہی اساس اخلاق ہے جس پر ان تینوں کی تعمیر ہوئی ہے۔ انسان کو



حیوان سمجھنا، دنیا کو بے خدا فرض کرنا، عموم طبعی سے انسانی زندگی کا قانون انکار کرنا، اور اخلاق کی بنیاد پر تجربہ و محنت پر رکھنا، یہ ان سب کی مشترک بنیاد ہے۔ ان کے درمیان فرق صرف اس حیثیت سے ہے کہ اس جاہلی تہذیب کے سب سے پہلے فرد کی آزادی اور قوموں کی انفرادیت کا نتیجہ بویا تھا جس سے قومی ریاستوں کے ساتھ سرمایہ دارانہ جمہوریت پیدا ہوئی اور مد تہائے دراز تک انسانیت کو تباہ و برباد کرتی رہی، پھر جب اس کے ظلم و ستم سے انسانی مصائب حد کو پہنچ گئے تو اسی تہذیب نے ائٹم کی انقلاب کو بطور علاج پیش کیا، مگر بہت جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ یہ علاج اصل مرض سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ آخر کار وہی تہذیب پھر ایک دوسری تجویز سامنے لائی جس کا نام فاشیزم یا نیشنل سوشلزم ہے اور چند سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس ام الجنائت کا یہ آخری بچہ فتنہ انگیز و شرابی میں پہلے دونوں پر خورد و آوندت بھی بازی لے گیا ہے۔

اب دنیا کے سوائے اس تہذیب کو اور زیادہ آزمانے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے جو آدمی کو جانور سمجھ کر اور اس جانور کو بے لگام فرس کر کے اپنا کام شروع کرتی ہے اور اس کے اندر جو روح بستر سے کمر بستہ ترین قسم کی درندگی تک بروہ بیماری پیدا کر دیتی ہے جو آدمیت کے حق میں نہایت اہلک ہے۔ درحقیقت یہ پوری تہذیب اپنی تمام شاخوں سمیت غیر طبعی کو پہنچ چکی ہے، امتحان کی مدت ختم ہو چکی ہے، اس کے پاس اب کوئی اور انچراپا یا قی نہیں رہا ہے جس کو نہ انسانی مسائل کے حل کا پیشہ پیش کر سکے، اور بالفرض اگر یہ اپنی زندگی کی اہمیت کے برعکس اپنے کے یٹکسی اور ازم کی تخلیق کا بہار کرے بھی تو فانی شدت اب یہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اسے اپنی زمین کو فسادت بھرنے کا کوئی اور موقع دے گا۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ فساد و م کے بعد اس کی فلاح میں سے کوئی شاخ باقی رہ جائے، مگر یقیناً اس کو بقا و عافیت ہوگا، بعد ہی وہ شاخ خود جمع کر اپنے اندر سے ایک تباہی کی صورت پیدا کرے اپنی ہی آگ سے اپنے بنیاد کو سمجھ جائے گا۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا اس تہذیب کی بیماری کے بعد دنیا میں پھر کوئی طاقت کا وہ آنا ہے یا کوئی نئی تعمیر ضرورت ہو گی؟ تو اس کا فیصلہ دو چیزوں پر منحصر ہے :



ایک یہ کہ جاہلیت خالصہ کی ناکامی کے بعد کوئی اور ایسا نظریہ انسان کو ملتا ہے یا نہیں جو پچھلے واسطہ نظریوں سے بہتر ہو جس سے انسانی عقل صلاح کی توقعات وابستہ ہو سکے اور جس پر ایک جاندار اور طاقتور تہذیب قائم ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ نوب انسان میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جس کے اندر چہ او اور اجتہاد کی وہ صلاحیتیں اور قوتیں ہوں جو ایک نئے نظریے پر ایک نئی تہذیب کا قیام کرنے کے لیے ضروری ہیں، اور جس کے اخلاق و اوصاف ان لوگوں سے مختلف ہوں جن کی بغاوت و شرارت کا ابھی قریب ہی ہیں انسان کو تجربہ ہو چکا ہے اگر ایسا کوئی نظریہ بروقت سامنے آجائے اور اس کو لے کر ایسی جماعت اٹھ کھڑی ہو تو یقیناً نوب انسانی ایک دوسرے دور طلعت پج سکتی ہے ورنہ کوئی قوت اس کو اس تاریک گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی یہ صدر عظیم جس سے انسانیت اس وقت دوچار ہے، یہ پھیڑیوں سے بدتر سلوک جو اس وقت آدمی آدمی کے ساتھ کر رہا ہے، یہ بے دردی و سنگدلی جو بھی دور وحشت میں بھی آدمی سے ظاہر نہیں ہوتی تھی، یہ سب یہی وقتاوت جس کی نظیر درندہ جانور بھی پیش کرنے سے عاجز ہیں، یہ علم و حکمت کے نتائج جو آج جہاں سوز و غم و رنج اور انسان پانسٹینکوں کی شکل میں دیکھے جا رہے ہیں، یہ تنظیمی قابلیتوں کے ثمرات جنہوں نے آج غارتگر فوجوں کی صورت اختیار کی ہے، یہ صنعتی ترقی کے پھل جو آج آلات جنگ کی بھیانک شکل میں نمودار ہو رہے ہیں، یہ وسائل و وسائل شاعت کا کمال جس سے آج دنیا میں جھوٹ بھیلانے اور قوموں میں منافرت بکھانے کا کام لیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ انسان کا دل توڑ دینے اور اس کو اپنے آپ سے اور اپنی ساری قابلیتوں اور صلاحیتوں سے مایوس کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے، اور اس کا فطری نتیجہ ہی ہو سکتا ہے کہ نوب انسانی دل شکستہ و مایوس ہو کر صدیوں کے لیے نیند اور بے ہوشی کی حالت میں مبتلا ہو جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں، انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور ایک صالح جماعت کا برسر کار آنا ہے۔



مگر وہ کونسا نظریہ ہو سکتا ہے جس کے لیے آج کامیابی کا کوئی موقع ہو؟

مشرکانہ جاہلیت جس پر دنیا کی بہت سی قدیم تہذیبیں قائم ہوئی تھیں، اب اس کے احیاء کا کوئی امکان نہیں۔ شرک کی جو کٹ چکی ہے جاہل عوام چاہے اس کا تہذیبی باقی ہو، مگر علم عقل رکھنے والے لوگ اب اس دہم میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ کائنات کے نظام کو بہت سے خدا چلا رہے ہیں، اور انسانی فلاح و سعادت کا سر رشتہ دیوتاؤں یا راجوں سے وابستہ ہے۔ علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ مشرکانہ نظریہ سے انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ پیچیدگیاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ بڑے بڑے مشکل جس نے اس وقت دنیا کو پریشان کر رکھا ہے، نوع انسانی میں وحدت کا فقدان ہے۔ مگر شرک اس مشکل کو حل نہیں کرتا، بلکہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے مزید تفریق و تقسیم کے اباب فراہم کرتا ہے۔ لہذا کسی مشرکانہ نظریہ کیلئے آج دنیا میں برسرِ اقتدار آنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ راہبانہ جاہلیت نے یہاں بھی کوئی طاقت نہیں تھی نہ بن سکتی ہے۔ کرا اور تراسخ اور اہنس اور تہم اور سیک نظریات جو روج کو سرد اور سموتوں کو پست اور قوسے فکر کو خیر و بخیر کی پینک میں مرت کر دینے والے ہیں، اپنے اندر اتنی جان ہی نہیں رکھتے کہ ان کے بل پر کوئی ایسی تہذیب پیدا ہو سکے جو زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہو اور دنیا کی امامت و پیشوائی کے منصبِ حلیل پر فائز ہو سکتی ہو۔ کوئی سامری اس بن مردہ میں روح پھونکنے کی جتنی چاہے کوشش کر دیکھے یہ نظریات کبھی گیان تیاگ اور تمپیا کے مقام سے آگے بڑھ کر ایک صالح تمدن کی تخلیق اور ایک نیا دل منکلت کی تاسیس اور ایک دین شانِ ہمدیہ کی تعمیر تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہذا مردہ و روزول قومیں تو ان نظریات کے چکر میں پڑی رہ سکتی ہیں مگر کسی زندہ اور ابھرنے والی قوم کے خیال کو یہ بھی پنی طرف نہیں کھینچ سکیں گے۔

رہی جاہلیتِ خالصہ تو اس کا اور اس کی پیداوار کا اب دنیا کو اتنا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ عنقریب وہ اس سے مایوس ہونے والی ہے۔ انسان کا اپنے آپ کو جانور نہس کرنا، جانوروں کی زندگی سے تنازع لبثقار اور انتخابِ طبعی اور بقائے اصلح کا قانون اپنے آپ سے اخذ کرنا، مادہ کی فوائد اور لذتوں کو تصورِ حیاتِ ٹھیرانا، تجربات اور مصالح کو اخذ کرنا، لہذا قرینہ، اویسی فوق انسانی قوتیں کو تسلیم نہ کرنا جو کچھ نتائج ہیں ان کے کتنا خداوندہ سبب اپنی تمام تہذیبوں کے



ساتھ سامنے آچکے ہیں ان نظریات کی بدولت انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ قومی اور نسلی تعصبات میں رنگ و نل کی برتری کے دعوے ہیں، قومی ریاستوں کی معاشی و سیاسی رقابتیں میں، قیصریت اور استعمار اور معاشی لوٹ کے فتنے ہیں، افراد سے لے کر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں تک کا اپنے معاملات میں ہر اخلاقی قید سے آزاد ہو جانا ہے، اور سب بڑھ کر یہ کہ انسان کا واقعی جانور بن کر کام کرنا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا بلکہ بے روح مشینوں کا سا سلوک کرنا ہے۔ یہ نظریات اگر جمہوریت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو ظلم اور کسب حرام اور فحش اور بے حیائی کی آزادی ملتی ہے۔ اور اگر اکثریت یا اجماعیت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو پھڑپھڑائیوں کے گتے کی طرح ایک ڈکٹیٹر یا ایک چھوٹی سی پارٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ انھیں جس طرح چاہے ہانکے اور ان کا جو جی چاہے بنائے۔ یہ پھل جو ان نظریات سے پیدا ہوئے ہیں، کسی اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اس شجر خبیث کی عین فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے پھل پیدا ہوں۔ لہذا جس طرح اب تک انسان اس سے کسی قسم کی فلاح نہیں پاسکا ہے اسی طرح آئندہ بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ انسانیت کے اس حیوانی تصور اور کائنات کے اس مادہ پرستانہ نظریے اور اخلاق کی اس تھرپی اور مصلحت پرستانہ بنیاد پر کوئی ایسا اجتماعی مسلک پیدا ہو سکے گا جو انسان کے لیے موجب فلاح ہو۔

ان سب نظریات کی ناکامی کے بعد دنیا اگر کسی نظریے سے فلاح کی امیدیں وابستہ کر سکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسا نظریہ ہی ہو سکتا ہے:

جو انسان کو انسان قرار دے نہ کہ جانور، جو اپنی ذات کے متعلق انسان کی رائے کو بہتر بنائے جس کا تصور انسانیت مغربی سائنس کے تصور حیوانی "اوریمیت" کے پیدائشی گھماؤ اور ہندومت کے "مجبور بناسخ" سے بلند تر ہو، جو انسان کو مختار مطلق اور شہر بے ہزار بنائے بلکہ اسے سلطان کائنات کے اقتدار اعلیٰ کا تابع قرار دے اور اس کے آگے ذمہ دار و جواب دہ ٹھہرائے،

جو اخلاق کے ایک ایسے قابل عمل ضابطے کا انسان کو پابند بنائے جس میں اپنی خواہشات کے مطابق رد و



بدل کرنے کا حق اس کو نہ ہو،

جو مادی بنیادوں پر انسانیت کو تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسی اخلاقی و روحانی بنیاد فراہم کرے جس پر

انسانیت متحد ہو سکتی ہو،

جو اجتماعی زندگی کے لیے ایسے اصول انسان کو دے جن پر افراد اور جماعتوں اور قوموں کے درمیان صحیح

اور متوازن عدل قائم ہو سکے،

جو زندگی کے نفس پرستانہ مقاصد سے بلند تر مقاصد اور قدر و قیمت کے مادہ پرستانہ معیاروں سے بہتر معیار

انسان کو دے،

اور ان سب خصوصیات کے ساتھ جو علمی و عقلی اور تمدنی ارتقائیں انسان کی صرف مدد ہی نہ کرے بلکہ صحیح

رہنمائی بھی کرے اور مادی و اخلاقی، ہر دو حیثیتوں سے اسے ترقی کی طرف لے جائے۔

ایسا ایک نظریہ اسلام کے سوا دنیا میں اور کونسا ہے؟ لہذا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے کہ اب انسانیت کا

مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔ انسان کے اپنے بنائے ہوئے تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی کے

لیے کامیابی کا اب کوئی موقع نہیں۔ اور انسان میں اب اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ پھر کسی نئے نظریہ کی تصنیف اور

اس کی آزمائش پر اپنی قسمت کی بازی لگائے۔ اس حالت میں صرف اسلام ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جس سے

انسان فلاح کی توقعات وابستہ کر سکتا ہے جس کے لیے نوع انسانی کا دین بن جانے کا امکان ہے۔ اور جس کی

پیروی اختیار کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے۔

لیکن اس سے نتیجہ کا لٹنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے، اسلام کی خوبیوں پر

ایک دغظ اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ،

امریکہ سب بڑھتے چلے جائیں گے۔ ایک تہذیب کا سقوط اس طرح اچانک نہیں ہو سکتا کہ کل تھی اور آج ناپید

ہو گئی۔ اور دوسری تہذیب کا قیام بھی اس طرح واقع نہیں ہوتا کہ آج میل میدان ہے اور کل کسی مٹر کے زور سے ایک



عالی شان قصبہ کھڑا ہو۔ گرنے والی تہذیب کے افکار، اصول، طریقے مدتہائے دراز تک دلوں اور دماغوں پر علوم و آداب پر اور تمدن و معاشرت پر اپنا اثر جمائے رہتے ہیں۔ اس اثر کا استیصال خود بخود نہیں ہو جاتا کرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح گرنے والی تہذیب کے علمبردار بھی نڈال پذیر ہونے کے باوجود سالہا سال تک زمین پر قبضہ جمائے رہتے ہیں۔ وہ خود جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹ جاتے، مٹانے سے ہٹتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس نئی تہذیب پر نئی عمارت بنانا بھی کوئی کھیل نہیں ہے کہ آپ سہولت سے بیٹھے رہیں اور وہ خود بن جائے۔ اس کام کے لیے ایک زبردست تنقیدی، تخریبی اور تعمیری تحریک کی ضرورت ہے جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پرانی تہذیب کی جڑیں اکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و آداب کو اپنی مخصوص فکری بنیادوں پر از سر نو مدون کرے حتیٰ کہ ذہنی دنیا پر اس طرح چھا جائے کہ لوگ انہی کے طرز پر سوچنا اور محسوس کرنا شروع کر دیں، ایک طرف ان پر پرانے سانچوں کو ڈھائے جن پر انسانیت ڈھلا کرتی تھی اور دوسری طرف نئے سانچے تیار کرے جن سے نئے اخلاق اور نئی سیرتوں کے آدمی ڈھلے لگیں، ایک طرف پرانے نظام تمدن و سیاست کو بزور مٹائے اور دوسری طرف ایک پورا نظام تمدن و سیاست اپنے اصولوں پر عملاً قائم کر دے۔

پس دنیا کو آئندہ دور ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ ان کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ صرف اسی صورت سے دیا جاسکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اس کے خود مطیع بنیں، جس ضابطہ پر ایمان لاتے ہیں اس کے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اس کا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں، اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اسے خود چھوڑیں۔ اس کے بغیر تو ان کی صدا آپ ہی مشتبہ ہوگی کجا کہ کوئی اس کے آگے تسلیم خم کرے۔ پھر ان کو اس فاسد نظام تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی۔ اس سے اور اس کے پیروں سے تعلق توڑنا ہوگا، ان تمام فائدوں،



لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو چھوڑنا ہو گا جو اس نظام سے وابستہ ہوں، اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہو گا جو نظام غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر کھینچ کر کچھ کرنا ہو گا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہو گا، اپنے اوقاتِ غریزہ بھی صرف کرنے پڑیں گے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا، اور قید اور جلا وطنی اور ضبطِ اموال اور تباہی اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہو سکتا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو، محض نظریہ، خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ ہو، کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پھیل سکتا۔ نظریہ کی کامیابی کے لیے خود اس کے اصولوں کی طاقت جس قدر ضروری ہے، اسی قدر ان انسانوں کی سیرت، ان کے عمل اور ان کی قربانی و سرفروشی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ زراعت کے طریقہ کی درستی، بیج کی صلاحیت، موسم کی موافقت سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں، مگر زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کہ ان اپنے عہدے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینہ سے، اور اپنی جفاکشی سے اس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ ہلکتی ہوئی کھیتی دکنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

اگرچہ خلوص ایمان اور قربانی و جان فدائی بہ دین کے قیام کے لیے ناگزیر ہے، خواہ وہ دین حق ہو یا دین باطل، مگر دین حق اس سے بہت زیادہ اخلاص اور قربانی مانگتا ہے جو دین باطل کے قیام کے لیے درکار ہے۔ حق ایک ایسا باریک بین و حریف ہے جو ذرا سی کھوٹ کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ خالص مونا چاہتا ہے۔ آزمائشوں کی کھیتی میں سے گذر کر تب تک اس کو کھوٹ بھل نہ جائے اور پورے عیار کا انداز نکل نہ آئے وہ اپنے نام سے اس کو بازار میں لانے کی ذمہ داری ادا نہیں کرتا، کیونکہ وہ حق ہے،



باطل نہیں ہے کہ کھوٹے سگے اور ملتے کیے ہوئے زیور بیچتا پھرے یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ.

(آل عمران - ۱۸)

سے الگ نہ کر دے۔

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان لانے والوں کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں) وہ نہ مانے گا جب تک کھوٹے کو کھری

أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ. وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ (عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے، چھوڑ دیے جائیں گے اور انہیں آزمائش کی کھٹی میں تیلیا نہ جائے گا؟ حالانکہ ان سے پہلے جو گزرا چکے ہیں (یعنی جنہوں نے بھی ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے) وہ

ضرور تپائے گئے ہیں۔ ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخَلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ؟ مَسَّيْنَاهُمُ الْبُاسَاءَ وَالضَّرَاءَ وَوَرَثُوا مِمَّا نَسُوا وَلَئِنَّ مِنْهُمْ لَفِتًى فَهُمْ عَلَىٰ خُذٍّ أُنْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ هَتَّىٰ نَصَرَ اللَّهُ (بقرہ - ۲۶)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت گزری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکی ہے؟ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ بلا مارے گئے حتیٰ کہ رسول اور اس کے ساتھی

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا أَنْ تَقُولُوا آمَنَّا وَلَمْ يَلْحَقْ بِكُمُ اللَّهُ الْبَاقُ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يُتَجِدُوا هِمًّا دُونِ اللَّهِ وَلَا سُلْطَانًا لَهُمْ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلَاحِقَةُ (توبہ - ۲)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم سب سے چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا۔ اور اللہ اور رسول اور اہل ایمان کے سوا کسی سے قلمی تعلق نہ رکھا۔



وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ  
فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةً النَّاسِ  
عَذَابَ اللّٰهِ، وَلَئِن جَاءَ نَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ  
لَيَقُولَنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ، أَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ  
بِمَا فِي قُلُوبِ الْعُلَمَاءِ، وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ  
الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ (الہکوت ۱۷)

اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر  
ایمان لائے مگر جب اللہ کی راہ میں نہیں تیا گیا تو ان لوگوں  
کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا  
چاہیے۔ حالانکہ اگر تیرے رب کی طرف سے نفع نصیب ہو جائے  
تو یہی لوگ اگر کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ کیا  
اللہ اہل دنیا کے دلوں سے خوب واقف نہیں ہے ہاں مگر

ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایماندار کون ہیں اور منافق کون۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَ  
نَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَ  
نَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ  
قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. أُولَٰئِكَ  
عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَ  
أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (بقرہ - ۱۹)

ہم ضرور تم کو خطرات اور فاقوں سے اور جان و مال اور کامیابیوں  
کے نقصانات سے آزمائیں گے اور کامیابی کی بشارت عید  
ان مستقل مزاج لوگوں کو جنہوں نے ہر مصیبت کی آمد پر کہا کہ  
ہم اللہ ہی کے ہیں اور آخر اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔  
ایسے لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے ہر باریاں ہیں اور  
رحمت ہے۔ اور یہی لوگ راہ راست پانے والے ہیں۔

قرآن یہ سب کچھ کہنے کے ساتھ اس حقیقت پر بھی متنبہ کر دیتا ہے کہ

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَاصْنَعَ مِنْهُمْ وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ (محمد - ۱)

یعنی یہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی خود نہیں کر سکتا اس لیے تم سے مدد مانگتا ہے۔ نہیں  
وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اشارے میں ان کو تباہ کر کے رکھ دے اور اپنے دین کو  
خود قائم کر دے، مگر اس نے یہ جہاد اور محنت و قربانی کا بار تم پر اس لیے ڈالا ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے  
کے مقابلہ میں آنا پاتا جاتا ہے۔ جب تک باطل پرستوں سے تمہارا تصادم نہ ہو، اور اس تصادم میں مسلمان



دشمن اور خطرات و ہمالک پیش نہ آئیں، سچے اہل ایمان چھوٹے مدعیوں سے فیر نہیں ہو سکتے، اور جب تک ناکارہ لوگوں میں سے کارآمد آدمی چھٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ حقیقتاً نہیں بن سکتے جو خلافت الہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔

لہذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریہ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں، کیونکہ نظریہ حق تو موجود ہے، البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پر ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جو سچے ایمان دار، دھن کے پکے اور اپنی بر عزیز و محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ اب کہاں مل سکتے ہیں، وہ تو بس ایک مبراہک دور میں پیدا ہوئے تھے اور پھر خالق نے اس ماڈل کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ لیکن یہ محض ایک دسم ہے اور ایسا دسم انہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنہیں خود اپنے آپ سے مایوسی ہے۔ دنیا میں ہر قابلیت اور ہر صلاحیت کے آدمی ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں جہاں منافقانہ خصوصیات رکھنے والے اور ضعیفہ الارادہ لوگ اور سہولت پسند اشخاص ہمیشہ پائے گئے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں، وہاں ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس کو سر بلند کرنے کے لیے سر دھڑکی بازی لگا سکتے ہیں آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو نہیں ہزاروں انسان ایسے ہیں جو ہنر اور جرمنی پر ایمان لائے ہیں اور وہ اپنے اس ایمان کی خاطر ہوائی جہاز سے عین دشمن کے ملک میں خربت لگاتے ہیں جہاں ان کو معلوم ہے کہ بے شمار تھکاری اُن کی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ روس کا انقلاب جو ابھی چوبیس سال پہلے ہی کی بات ہے، اُس کی تاریخ آپ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہزار ہا آدمی جو انقلابی نظریات پر ایمان رکھتے تھے مسلسل نصف صدی تک ہر قسم کی قربانیاں کرتے رہے، سائبیریا کے جہنم میں بھیجے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، جلا وطنی کی حالت میں برسوں ملک ملک کی خاک چھانتے پھرے، اپنی ذاتی خوش حالی کی تمام خواہشوں اور تمناؤں کا خون کیا، خانماں بربادی کو خود اپنے ہاتھوں میں لیا، اور یہ سب کچھ اس وقت کیا جب کہ زار



کی سلطنت کے مٹنے کا تصور بھی مشکل ہی کیا جاسکتا تھا اور نہ جاسیے۔ خود ہندوستان ہی کو دیکھ لیجیے، یہاں جو نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ کثرت و خون کے ذریعہ سے وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکیں گے، انہوں نے اپنے مقصد کے پیچھے اپنی زندگیوں کو قربان کر دیا اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں کیا کسر اٹھا رکھی؟ کوئی ممکن تصور مصیبت ایسی تھی جسے انہوں نے برداشت نہ کیا ہو؟ قید خانوں میں شدید ترین اذیتیں اٹھائیں، جس دوام میں عمریں گزار دیں، چٹائی کے تختہ پر جانیں تک دیدیں۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کے طریقے صحیح تھے یا غلط، مگر اس سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کسی مقصد پر ایمان لانے کے بعد اس کے لیے جان و مال اور شخصی امنگوں کی قربانی گوارا کرنے اور مصیبتیں سہنے کی صفت آج بھی انسانوں میں ناپید نہیں ہے۔ گاندھی جی کی سول نافرمانی ابھی حال ہی کی بات ہے۔ کیا اسی ہندوستان کے باشندوں میں ایسے لوگ موجود نہ تھے جنہوں نے لاکھیاں کھائیں، جیل گئے اور مالی نقصانات برداشت کیے؟ کیا بارہولی کے کسادوں نے اپنی زمینوں، اپنے جانوروں اور اپنے گھروں کے برتنوں تک کی ترقی اور یتیم کو صبر کے ساتھ برداشت نہیں کیا؟ پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ آج ایثار و قربانی کی وہ صفات انسانوں میں مفقود ہیں جو پہلے لوگوں میں پائی جاتی تھیں۔ اگر ہٹلر اور ارکس اور گانڈھی پر ایمان لاکر انسان یہ سمجھ کر کہہ سکتا ہے تو کیا خدا پر ایمان لاکر کچھ نہیں کر سکتا؟ اگر خاک و وطن میں اتنی کشش ہے کہ اس کے لیے آدمی جان و مال کی قربانی گوارا کر سکتا ہے تو کیا خدا کی رضا اور اس کے تقرب میں اتنی کشش بھی نہیں ہے؟ پس جو لوگ خود بہت ہمت اور ضعیف انداز ہیں انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کا پرلیم کہ ہے جن انوار العزم انسانوں کی ضرورت ہے وہ کہیں باقی نہیں رکھتے، البتہ اپنی ذات کی حد تک وہ غرور کہہ سکتے ہیں کہ اَدْهَبَ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَتِلْكَ اَنْتَ اَهْمُ قَاعِزُونَ۔



# جماعت اسلامی کی تشکیل

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے، اس سے چار حقیقتیں پوری طرح واضح ہو جاتی ہیں:  
 ایک یہ کہ اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بنیادی طور پر بدل دینا ہے،  
 دوسرے یہ کہ یہ کئی واساسی تغیر صرف اسی طریقہ پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا،  
 تیسرے یہ کہ مسلمانوں میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ نہ اس مقصد کے لیے  
 ہے اور نہ اس طریقہ پر ہے،

چوتھے یہ کہ اب ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں اسلامی جماعت ہو اور اسلامی نصاب  
 بعین کے لیے اسلامی طریقہ پر کام کرے۔

میں نے اور میرے ہم خیال لوگوں نے کامل تین سال اس امر کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں جو بڑی  
 بڑی جماعتیں اس وقت قائم ہیں وہ سب یا کم از کم ان میں سے کوئی ایک اپنے نظام اور پروگرام میں ایسی  
 تبدیلی کرے جس سے اسلام کی یہ ضرورت پوری ہو جائے اور ایک نئی جماعت بنانے کی حاجت باقی نہ رہے،  
 مگر افسوس کہ ہمیں اپنی اس کوشش میں پوری ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ  
 نہ رہا کہ ان لوگوں کو جمع کریں جو موجودہ جماعتوں کے طرز عمل سے غیر مطمئن اور صحیح اسلامی اصول پر کام کرنے  
 کے خواہش مند ہیں۔ چنانچہ شعبان ۱۳۶۷ھ (اگست ۱۹۴۷ء) میں ہم نے ان لوگوں کا اجتماع منعقد کیا اور باہمی  
 مشورہ سے جماعت اسلامی قائم کی جس کا دستور یہاں نقل کیا جاتا ہے۔



# دستور جماعت اسلامی

## عقیدہ

۱۔ جماعت اسلامی کا بنیادی عقیدہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے یعنی صرف اللہ ہی

ایک الہ ہے، اس کے سوا کوئی الہ نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

تشریح ۱۔ اس عقیدے کے پہلے جز یعنی اللہ کے الہ واحد ہونے اور کسی دوسرے کے الہ نہ ہونے

کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان، اور جو کچھ آسمان و زمین میں ہے، سب کا خالق، پروردگار، مالک، مدبر

اور حاکم صرف اللہ ہے، ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

اس حقیقت کو جاننے اور خلیفہ کرے سے اہم آتا ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی و کار یا

حاجت روا اور مشکل کشا، فریاد رس اور نائی و ناعمر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کائنات اور ہی نہیں ہے۔ اللہ

کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی

سے امیدیں وابستہ نہ کیے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک وہی اکینا ہے۔ اللہ کے سوا کسی سے دعا مانگے،

کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے کسی کو مدد کے لیے نہ پکارتے کسی کو خدائی انتظامات میں اپنا ہنر اور رد آور بھی

سمجھے کہ اس کی مفارش و قنار الہی مل سکتی ہو، کیونکہ خدائی سغف میں سب بہ اختیارات عیب سے پاک ہیں۔

فرشتے، پھول، پتیاں، درخت، انسان، جانور، گیہو، پھوس، کسی کی برکت نہ کرے، کسی کو راز دہ

لحاظ اور یہ میں اصولی فرق ہے۔ نذر بنوا عترت و نعمت کے طور پر کسی ایسی چیز کو نہ مانے جس کا

جس کے اندر ہونے کا تصور آدمی کے ذہن میں ہوتا ہے، باوجود اہم و اہم نہ ہونے کی حیثیت سے کسی کو نہ مانے۔



اور کسی کے ساتھ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں، کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک، مقتدرِ اعلیٰ نہ تسلیم کرے، کسی کو باختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے، کسی کو شارع اور قانون ساز نہ مانے، اور ان تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ کی اطاعت کے ماتحت اور اس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں، کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک، اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے، اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدہ کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ: انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جائے، اپنی خواہش نفس کی بندگی چھوڑ دے، اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الہ تسلیم کیا ہے۔ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک نہ سمجھے، بلکہ ہر چیز، حتیٰ کہ اپنی جان، اپنے اعضاء، اور اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اور اس کی طرف سے امانت سمجھے۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اسے اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔ اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی تمام سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھہرائے۔ اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت اور صرف اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطہ کو ضابطہ تسلیم کرے، اور ہر اس طریقہ کو رد کر دے جس کا اللہ کی طرف سے ہونا ثابت نہ ہو۔

(بقیہ سابق) ایسے شخص کے حضور میں گذرانی جاتی ہے جسے آدمی مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرتا ہے۔ بخلاف اس کے ہدیہ ایک انسان دوسرے انسان کو مخلصانہ محبت کی بنا پر دیتا ہے اور اس میں اعترافِ نعمت یا اعترافِ بالائتاری کا کوئی تصور شامل نہیں ہوتا۔ اسی لیے اسلام میں ہدیہ جائز اور نذر غیر اللہ حرام ہے۔



اس عقیدہ کے دوسرے جز یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سلطان کائنات کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبی کے ذریعہ سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا، اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کیا گیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امر واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ: انسان ہر اس تعلیم اور ہر اس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ اس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسول خدا سے ثابت ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری دلیل پر اس کی اطاعت موقوف نہ ہو۔ رسول خدا کے سوا وہ کسی کی منتقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے، دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے تحت ہونہ کہ اس سے آزاد۔ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے، جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب سنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے، جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کرے، اور جو مسالہ بھی حل طلب ہو اسے حل کرنے کے لیے اسی سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔ تمام عصیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی یا قبائلی یا قباوی، و وطنی، یا فرقی دگروہی۔ کسی کی محبت یا عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ اسے خدا کے واسطے حق کی محبت و عقیدت پر ذہ غائب آجائے یا اس کی مد مقابل بن جائے۔ رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اس معیار کا مل پر دبانچے اور پچھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے۔

## نصب العین

۲۔ جماعت اسلامی کو نصب العین اور اس کی تمام سعی و بہد کا مقصد دینا میں حکومت الہیہ کا قیام اور



آخرت میں رضائے الہی کا حصول ہے۔

**تشریح :-** جہاں تک امر تکوینی کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ کی حکومت آپ اپنے زور پر قائم ہے اور اس سے بالاتر ہے کہ معاذ اللہ اس کا قیام و بقا بندوں کی مدد کا محتاج ہو۔ تمام مخلوقات خواہ ارضی ہوں یا سماوی اس کے قہر و غلبہ سے مغلوب ہیں، اس کے زبردست قانون کی بندش میں جکڑی ہوئی ہیں، کسی میں اس کے حکم سے ستر تابی کا بار نہیں، اور دوسری مخلوقات کی طرح انسان بھی، خواہ مومن ہو یا کافر، اللہ کی تکوینی حکومت کے تحت محض ایک بندہ مجبور ہے۔ لہذا حکومت الہیہ کے قیام سے مراد اللہ کی تکوینی حکومت کا قیام نہیں ہے، بلکہ دراصل اس سے مراد اللہ کی شرعی حکومت کا قیام ہے جس کا تعلق صرف انسان سے اور انسان کی زندگی کے بھی اس حصہ سے ہے جس میں اللہ نے انسان کو اختیار عطا کیا ہے۔

انسان کی زندگی کا جو حصہ حیوانی و طبعی ہے اس کو تو اللہ تعالیٰ نے حکم تکوینی کے ماتحت رکھا ہے، اور اس حصہ میں انسان دوسری تمام مخلوقات کی طرح بہر حال مسلم (مطیع) ہے، مگر جو حصہ انسانی ہے، یعنی جس میں انسان جفل اور تمیز استعمال کر کے خود اپنے ارادہ سے کام کرتا ہے، اس میں اللہ نے اسے آزادی عطا کی ہے کہ چاہے خود مختار بن کر کام کرے، چاہے اللہ کے سوا کسی اور کا بندہ بن جائے، چاہے خود خدائی کا مدعی بن کر دوسروں کو اپنا بندہ بنائے، اور چاہے تو اپنے اصلی مالک کو پہچان کر برضا و رغبت اس کی بندگی اختیار کرے۔ یہ آزادی جو اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی ان چاروں صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کرے گا وہ یکساں جائز اور حق ہوگی۔ نہیں، اس انتخاب و اختیار میں آدمی کو آزاد چھوڑنے کا مدعا دراصل امتحان اور آزمائش ہے۔ جائز اور حق تو صرف یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اختیاری حصہ میں بھی اسی طرح اپنے خالق کا مطیع ہو جس طرح وہ اپنی زندگی کے غیر اختیاری حصہ میں اس کا مطیع ہے۔ کیونکہ حقیقت میں وہی ایک جائز فرمان روا ہے اور اسی کی اطاعت کائنات کے مجموعی نظام کے ساتھ صحیح مناسبت رکھتی ہے، لیکن اللہ نے اس طریق حق پر چلنے کے لیے انسان کو مجبور نہیں کیا،



بلکہ اسے آزاد چھوڑ دیا تاکہ اگر وہ حق کو پہچانے اور آزادی رکھنے کے باوجود خود اپنی خوشی سے بندگی کا طریقہ اختیار کرے تو اسے ابدی انعام سے سرفراز کیا جائے، اور اگر وہ اسے نہ پہچانے یا پہچاننے کے باوجود خواہشاتِ نفس کا ایسا غلام ہو کہ مالکِ حقیقی کی اطاعت گوارا نہ کرے تو اس کو ابدی سزا دی جائے۔

چونکہ اس امتحان و آزمائش کی غرض سے اللہ نے انسان کو خود آزادی عطا فرمائی ہے اس لیے وہ اپنی فرماں برداری کا حق تسلیم کرانے کے لیے اپنی اس قابضہ طاقت سے کام نہیں لیتا جس کو وہ اگر چاہتا تو پہلے ہی استعمال کر سکتا تھا اور چاہے تو ہر وقت استعمال کر سکتا ہے۔ جبر و زور سے مغلوب کرنے کے بجائے وجہت و برہان کے ساتھ نصیحت و فہمائش کرنے کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ انسان کو سمجھاتا ہے کہ درحقیقت زمین و آسمان کا مالک میں ہوں، تو میری مخلوق اور میری رعیت ہے اور تیرے لیے بھلائی اسی میں ہے کہ جو امر واقعی ہے اس کو تسلیم کر کے تو میرا مطیع و فرماں بردار بندہ بن جائے۔ اس فہمائش کے کام میں اللہ نے ربِّ پہلے تو ان انسانوں سے مدد لی ہے جن کو اس نے اپنا رسول مقرر کیا تاکہ وہ دلائل سے انسان کو حقیقتِ نفس الامری یعنی اللہ واحد ہی کے تہما مالک و مدبر کائنات اور عالمِ ذی اقتدار ہونے کا یقین دلائیں اور بطورِ رغبت اس کی اطاعت اختیار کرنے پر راضی کریں۔ پھر جو انسان رسولوں کی فہمائش سے حقیقت کو جان گئے ہوں اور جان کر اس کے پیرو بن چکے ہوں ان سے اللہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم اس کام میں میری مدد کرو۔ چنانچہ قرآن میں بار بار فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارًا

اے ایمان لانے والو! اللہ کے مددگار بنو۔

إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ

اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنِ الْبَصِيرُ

اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں

کی مدد کرتا ہے، ورنہ اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ پردہ غیب میں چھپا ہوا ہے۔

وَلِيَعْلَمَنَّ اللَّهُ مَنِ الْبَصِيرُ

اللہ ضرور ہی اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا۔



پس اللہ کی معبودیت و حاکمیت کا اقرار کر کے، اور اُس کی بندگی و اطاعت اختیار کر کے مومن کا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے بعد یہ خدمت اس کے سپرد کی جاتی ہے کہ وہ جاہل انسانوں کو اسی حقیقت سے آگاہ کرے جس سے وہ خود آگاہ ہوا ہے، اور باغی انسانوں کو اسی رب کی بندگی اور اسی حاکم اعلیٰ کی اطاعت پر آمادہ کرے جس کا وہ خود بندہ اور مطیع بنا ہے۔ اسی خدمت کی انجام دہی میں اللہ کی رضا ہے، اور اسی کے لیے اللہ اور مومن کے درمیان وہ معاہدہ عمل میں آتا ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَرِضُوا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ

أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوا

فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُوا وَيُقْتَلُوا

وَعَدًّا عَلَيْهِمْ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ

وَالْفُرْقَانِ، وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ

فَأَسْتَبْشِرُوا بَبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ

وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التوبة - ۱۲)

در حقیقت اللہ نے (اپنے کام کے لیے) مومنوں سے

ان کی جانوں اور اُن کے مالوں کو خرید لیا ہے جس کے معاوضے

میں اُن کے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں

(اور اس ٹرائی میں) مارتے بھی ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں

(اس کے معاوضے میں جنت کا) وعدہ اللہ کے ذمہ ہے اور

یہ بچا وعدہ ہے جو توراۃ اور انجیل اور قرآن میں کیا گیا ہے

اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا

ہے، لہذا اپنی اس بیع پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ کے ساتھ طے کی ہے کہ یہی عظیم انشان کا میانی ہے۔

انسان کی زندگی کے اختیاری حصہ میں اللہ کے جس قانون کی اطاعت مطلوب ہے وہ اس کا قانون

تکوینی نہیں ہے بلکہ اُس کا وہ قانون شرعی ہے جو رسولوں کے واسطے سے آتا ہے اور اس قانون کا تعلق عقائد،

اخلاق، معاشرت، تمدن اور ریاست وغیرہ سے ہے۔ محض تکوینی حیثیت اللہ کو خالق اور مدبر کائنات اور مالک

ارض و سماں لینا کافی نہیں بلکہ سیاسی حیثیت سے اسی کو بادشاہ اور حاکم اور قانون ساز ماننا بھی ضروری ہے

اور اسی کے بتائے ہوئے اصول اخلاق اور عدو و قانون کی پیروی لازم ہے، اگر صرف تکوینی حیثیت سے کوئی

اللہ کو مانتا ہو اور لاشریک مانتا ہو لیکن انسانی زندگی کے اختیاری حصہ میں خود اپنے مختار مطلق ہونے کا ادعا



کرے، یا زمین کے کسی حصہ پر اپنی حاکمیت کا مدعی ہو اور کہے کہ یہاں میں اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہوں گا حکومت چلاؤں گا جیسا کہ نظام بادشاہی میں ہر بادشاہ، نظام آمریت میں ہر ڈکٹیٹر، نظام برہمنی و پاپائی میں ہر مذہبی پیشوا، نظام جمہوری میں جمہوریت کا ہر شہری کہتا ہے، اور جیسا کہ انفرادی زندگی میں ہر اس شخص کا نفس کہتا ہے جو خدا کی اطاعت کا قائل نہ ہو، تو دراصل وہ خدا کے مقابلہ میں بغاوت کرتا ہے۔ اور علیٰ ہذا القیاس جو شخص اس شعبہ زندگی میں کسی دوسرے کی حاکمیت و آمریت تسلیم کرتا ہے وہ بھی بغاوت ہی کا ارتکاب کرتا ہے۔ مومن کا کام اس بغاوت کو دنیا سے مٹانا اور خدا کی زمین پر خدا کے سوا ہر ایک کی خداوندی شتم کر دینا ہے۔ مومن کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ جس طرح خدا کا قانون تکوینی تمام کائنات میں نافذ ہے اسی طرح خدا کا قانون شرعی بھی عالم انسانی میں نافذ ہو۔ مومن کی تمام مساعی کا ہدف مقصود یہ ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے سوا ہر ایک کی بندگی سے نکالے اور صرف خدا کا بندہ بنائے۔ یہ کام فی الصل توفیق، نہایت ترغیب اور تبلیغ ہی سے کرنے کا ہے لیکن جو لوگ ملک خدا کے ناجائز مالک بن بیٹھے ہیں اور خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لیتے ہیں وہ عموماً اپنی خداوندی سے محض نصیحتوں کی بنا پر دست بردار نہیں ہو جاتا کرتے، اور نہ وہ اس کو گوارا کرتے ہیں کہ عامۃ الناس میں حقیقت کا علم پھیلے، کیونکہ اس سے ان کو خطرہ ہوتا ہے کہ ان کی خداوندی خود بخود ختم ہو جائے گی، اس لیے مومن کو مجبوراً حنک کرنی پڑتی ہے تا کہ حکومت اہلبیہ کے قیام میں بریتیز سڈراہ ہوا سے راستہ سے ہٹا دے۔

## نظام جماعت

۳۔ ہر وہ شخص (خواہ مرد ہو یا عورت اور خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، اور خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ کا باشندہ ہو) جو عقیدہ  $\text{لا اله الا الله محمد بن رسول الله}$  کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ سمجھ کر شہادت دے کہ یہی اس کا عقیدہ ہے، وہ اس جماعت کا مومن ہو سکتا ہے۔ اس شہادت

لے تسلیم کرنے سے، اور اس کو جواز اور صحیح تسلیم کرنا ہے۔



کے سوا اس جماعت میں داخل ہونے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے۔

تشریح :- اس جماعت میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں کر لیا جائے گا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہو گا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمہ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آ سکتا۔ اس دائرے میں آنے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمہ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو، وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا، اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اور یہ شہادت اس کے طرز خیال اور طرز زندگی میں کس قسم کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جانتے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ کہنے کی جرات کرے صرف وہی اس جماعت میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ نسلًا غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدا نشی مسلمان ہو اور اب پورے فہم و شعور کے ساتھ اپنے سابق ایمان کی تجدید کرے۔

۴۔ اسے شہادت کے بعد جو تغیرات ہر رکن جماعت کو اپنی زندگی میں لازماً کرنے ہوں گے

دو یہ ہیں :-

(۱) فرائض کو ان کی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادا کرے،

(۲) کبائرت سے اجتناب کرے اور اگر ناخالص کسی کبیرہ کا ترکیب ہو جائے تو اس سے توبہ کرے،

(۳) اگر وہ کوئی ایسا ذریعہ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے، مثلاً سود، شراب،

زنا، رقص و سرود، شہادت زور، رشوت، خیانت، قمار، قتال فی غیر سبیل اللہ وغیرہ، تو اس کو ترک کر دے،

۵۔ اس لحاظ کے کہ اس کے ترک کرنے میں کتنا ہی نقصان ہو، اور اگر اس کی معاش میں ان وسائل کا

مذہب اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ایسے لوگوں کو مسلمان نہیں سمجھتے، بلکہ صرف یہ ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد

کے لیے جو جماعت ہم بنا رہے ہیں اس میں شامل ہونے کے لیے اس قسم کے مسلمان مفید نہیں ہیں۔



کچھ حصہ شامل ہو تو وہ اس حصہ سے اپنی معیشت کو پاک کرے،

(د) اگر اس کے قبضہ میں ایسا مال (یا جائداد) ہو جو حرام طریقہ سے آیا ہو، یا جس میں مقدار دلت

کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دست بردار ہو جائے اور اپنی حقوق کو ان کے حق پہنچا دے،

(ک) اگر وہ کسی ایسی حکومت کا صدر، یا رئیس، یا گورنر، یا وزیر یا جج ہو جو زمین کے کسی حصہ پر

حاکمیت (Sovereignty) کی مدعی ہو تو اپنے اس منصب سے دست بردار ہو جائے،

(د) اگر وہ کسی مجلس قانون ساز کا رکن ہو تو اس سے مستعفی ہو جائے کیونکہ جو مجلس قرآن اور سنت

رسول کو اساس اور منبع قانون تسلیم نہ کرے، اسلام کی رو سے اس کو انسانی زندگی کے لیے قوانین بنانے

کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور اس کی رکنیت قبول کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہے،

(ز) اگر وہ کسی غیر الہی نظام کی طرف سے خطاب رکھتا ہو تو اس کو واپس کرے اور ان وفاداریوں

اور نیاز مند یوں سے باز آئے جن کی بدولت اُس نے خطاب یا تقابلات کو اب خطاب یافتہ ہونے کی وجہ

سے نباہنا پڑتا ہے۔

یہ تغیرات جس شخص کی زندگی میں فوراً رونما نہ ہوں اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ کلمہ شہادت اور

کرنے میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جہالت میں نہ لیا جائے گا، یا بہانہ دے گا، جو جو خارجہ کو اس کے

۵۔ ادائے شہادت کے بعد جو تغیرات برائیں جماعت کو منہ سے اس کی زندگی میں آئے ہوں گے

وہ یہ ہیں۔

(۱) دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کر لینا کہ اس میں اور جاہلیت و فساد میں (۱) فرق معلوم ہو اور وہ

واقفیت ہو جائے،

۱۔ یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا ہوگا جہاں خدا رکھ معلوم ہوں وہ مال بھی معاشرہ مقیم ہو جس میں

حق تلف ہو رہا ہے۔ بصورت دیگر صرف توہ اور منہ دلت سے علم حاصل کی اس میں کمال ہوگی۔



(ب) تمام معاملات میں اپنے نقطہ نظر، خیال اور عمل کو ہدایت الہی کے مطابق ڈھالنا، اپنی زندگی کے مقصد، اپنی پسند اور قدر کے معیار، اور اپنی وفاداریوں کے محور کو تبدیل کر کے رضائے الہی کے موافق بنانا اور اپنی خود سری اور نفس پرستی کے بُت کو توڑ کر تابع امر رب بن جانا،

(ج) ان تمام رسوم جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف ہوں، اور اپنے ظاہر و باطن کو احکام شریعت کے مطابق بنانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا،

(د) اُن تعصبات اور دُچسپیوں سے اپنے قلب کو، اور ان مشاغل اور جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جن کی بنا، نفسانیت یا دنیا پرستی پر ہو اور جن کی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو،

(ه) فاسقین و فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے ربط و تعلق توڑنا اور صالحین سے ربط قائم کرنا،  
(و) اُن تمام اداروں سے تعلق منقطع کرنا جو جاہلیت کی خدمت کرتے ہوں اور جن کا مقصد حاکمیت رب العالمین کے اثبات و قیام کے سوا کچھ اور ہو (ایسے اداروں کے ساتھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے تعاون یا صلح و موافقت کے معاملات کیے جاسکتے ہیں، مگر یہ افراد کا کام نہیں بلکہ جماعت کا کام ہے، کوئی رکن جماعت انفرادی طور پر ایسے کسی ادارے کا جز نہیں بن سکتا)

(ز) اپنے معاملات کو راستی، عدل، خدا ترسی، اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا،

(ح) اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو قیام حکومت الہیہ کے نصب العین پر مرکوز کر دینا اور اپنی ضروریات زندگی کے سوا اُن تمام مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں،  
ضروری نہیں کہ یہ تغیرات تمام اشخاص میں کمال درجہ پر ہوں، مگر ہر شخص کو اس باب میں اپنی تمکین کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ انہی تغیرات کے اعتبار سے ناقص یا کامل ہونے پر جماعت اسلامی میں آدمی کے مرتبے کا تعین ہوگا۔

۶۔ جو لوگ غیر الہی نظام حکومت کو چلانے میں آلہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں یا غیر الہی قانون کے



اجزاء میں مددگار بنتے ہیں اُن کی تین حیثیتیں ہیں :-

اگر وہ اپنے اس کام پر خوش اور مطمئن ہیں اور اپنے اس کرب کے حلال و طیب سمجھتے ہیں اور اسی راہ میں ترقی درجات کے متمنی ہیں تو اُن کے لیے اس جماعت کے دائرے میں کوئی جگہ نہیں۔

اگر وہ اس نظام کو غلط اور اپنے اس کرب کو حرام سمجھتے ہیں، مگر اعتراف گناہ کے باوجود اس کو محض ضعیف ایمان کی وجہ سے ترک نہیں کر سکتے، تو وہ اس جماعت میں داخل ہو سکتے ہیں اور اُن کا شمار تیسرے درجہ کے ارکان میں ہو گا جس کی تشریح آگے آتی ہے۔

اگر وہ محض اس مجبوری سے اس نظام میں منسلک ہیں کہ دوسرا ذریعہ زندگی نہیں پاتے، اور نیک نیتی کے ساتھ اس بات کے لیے تیار ہوں کہ دوسرا ذریعہ پاتے ہی اُسے ترک کر دیں گے، تو وہ بھی جماعت میں داخل ہو سکتے ہیں اور ان کا شمار دوسرے درجہ کے ارکان میں ہو گا جیسا کہ آگے آتا ہے۔

**تشریح :-** یہ واضح رہے کہ غیر الہی نظام اطاعت کے ایک جز اور دوسرے جز میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے جو اجزاء بظاہر بالکل معصوم نظر آتے ہیں وہ بھی اسی قدر ناپاک ہیں جس قدر دوسرے غیر معصوم اجزاء۔

نیز جو غیر الہی نظام اطاعت مسلمانوں کی خداوندی میں چل رہا ہے وہ بھی اپنے تمام اجزاء سمیت اسی حکم میں ہے۔ مسلمان کی خداوندی اس کو ہرگز کوئی نہ جہارت عطا نہیں کرتی۔

۷۔ جہاں ایک شخص جس قاعدہ جماعت میں داخل ہو اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے حلقہ تعارف میں بدگمان خدا کو بالعموم جماعت کے عقیدے اور نصب العین کی طرف جس کی تشریح دفعہ اول و دوم میں کی گئی ہے دعوت دے اور جو لوگ اس عقیدے اور نصب العین کو قبول کر لیں انہیں قیام حکومت الہیہ کے لیے جدوجہد کرنے پر اکسائے۔ جماعت کے نظام میں شامل ہونے کی دعوت کسی کو نہ دی جائے، البتہ جو شخص خود اس جماعت کے عقیدہ و نصب العین سے متفق اور اس کے نظام و طریق کار سے مطمئن ہو کر اس میں داخل ہوئے ہو، آئندہ ہو، سو کہیں بنایا جائے۔ جہاں کم از کم دو تین موجود ہوں وہاں مقامی جماعت قائم کر لی جائے اور مرکز کو اطلاع



دے کر ہدایات حاصل کی جائیں۔

۸۔ اس جماعت میں آدمی کے درجہ و مرتبہ کا تعین اس کے حرب و نسب اور علمی اسناد اور مادی حالات کے لحاظ سے نہ ہوگا بلکہ اس تعلق کے لحاظ سے ہوگا جو وہ اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے ساتھ رکھتا ہو۔ اور جماعت کو اس کے اس تعلق کا ثبوت اس کی ان نفسی، جسمانی اور مادی قربانیوں سے ملے گا جو وہ اللہ کے دین کی راہ میں کرے گا۔

جماعت کے اندر ایسے لوگ اول درجہ میں شمار کیے جائیں گے جو تنہا دھن سے شریک جماعت ہوں اسلامی نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں۔ اپنے آپ کو بلا کسی احتیاط و انتشار کے اس طرح جماعت کے حوالے کریں کہ جب ان کو پکارا جائے، بلید کہیں، جو خدمت ان کے سپرد کی جائے، انہیں م دیں، اور جان، مال، اولاد وغیرہ، اقارب، دوست غرض کسی چیز کو بھی مقصد اسلامی سے غریزہ نہ رکھیں۔ احکام شریعہ کی پابندی میں رخصت کے بجائے غریمت کے طریقہ پر عامل ہوں۔ غیر الہی نظام حکومت کے ساتھ ناگزیر تمدنی ضروریات کے اسوہ کسی قسم کا اختیاری تعلق نہ رکھیں۔ غیر الہی عدالت میں تنہا مدعی کی حیثیت سے نہ جائیں۔ بجز شدید اضطراری حالات کے جن میں بشرط امکان امیر جماعت سے اجازت لے لی گئی ہو اور مدعی علیہ یا مستندات علیہ کی تثبیت سے صرف ایسے حالات میں جائیں جبکہ غیر معمولی نقصان کا اندیشہ ہو۔ ایسے لوگ اپنے عہد میں پوری طرح صادق سمجھے جائیں گے، یہی جماعت کے اصل کارکن و کارفرما لوگ ہوں گے اور رہنمائی و سربراہ کاری انہی کے ہاتھ میں ہوگی جو ارکان جماعت اپنے آپ کو جماعت کے کام میں بالکل وقف نہ کریں، نہ خطرات اور قربانیوں کا پورا بار اٹھائیں، نہ غیر الہی نظام سے درجہ اول کے لوگوں کی طرح قطع تعلق کریں، مگر احکام دین کی پوری اطاعت کرتے رہیں، ان وسائل کسب رزق اور مشاغل سے مجتنب رہیں جو براہ راست دین حق کے خلاف ہیں، صدق دل سے جماعت کے خیر خواہ و وفادار ہوں، اور اپنے وقت اور اپنے مال اور اپنی قوتوں کا ایک حصہ اپنی ذات کی خدمت سے بچا کر خدا کی راہ میں وقف کر دیں ان کا شمار دوسرے درجہ کے ارکان میں ہوگا۔



جو لوگ جماعت کے عقیدہ و نصب العین اور اس کے مقتضیات کو اصولی حیثیت سے تسلیم کریں اور اس دستور کی دفعہ سوم و چہارم کے مطابق رکنیت کی لازمی شرائط بھی پوری کر دیں، مگر غیر الہی نظام سے ان کے جو مفاد و بہتہ ہیں ان کا نقصان گوارا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، یا جماعت کے کاموں میں کسی خاص سرگرمی کا اظہار نہ کریں اور اپنی حیثیت کے مطابق مال، وقت اور قوت اس راہ میں صرف نہ کریں، ان کا شمار ہم سے درجہ کے ارکان میں ہوگا اور وہ بس جماعت کے ہم در سمجھے جائیں گے۔

### عورتوں کی حیثیت

۹۔ جو عورتیں جماعت اسلامی میں داخل ہوں ان پر دفعہ چہارم اور دفعہ پنجم کے تمام ان جزاء کا اطلاق ہوگا جو مخصوص طور پر مردوں سے متعلق نہیں ہیں۔

۱۰۔ رکن جماعت ہونے کی حیثیت سے عورتوں کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:-

(۱) اپنے خاندان اور اپنے حلقہ تعارف میں اس جماعت کے عقیدہ و نصب العین کی دعوت دینا۔

(۲) اپنے شوہروں، بھائیوں اور خاندان کے دوست و مردوں پر بھی اس کی تبلیغ کریں۔

(۳) اپنے بچوں کے دلوں میں نور ایمان پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

(۴) اگر ان کے شوہر یا بیٹے یا باپ اور بھائی جو مسلمان و مسلم ہیں تو اپنی علامت و نشان سے ان کی اہمیت

افزانی کریں اور جماعت کے نصب العین کی خدمت میں جتنی ممکن ہو اپنا حصہ لیں اور ان کی صورت میں غیبت و بدگمانی

(۵) اگر ان کے شوہر یا اولاد یا بھائی یا بھائیوں کے جرائم کا سامنا ہو تو ان کی اصلاح و توبہ کے ساتھ

ان کی اصلاح کے لیے سعی کریں، ان کی حرم کی صفائی و دھوئی کی ضرورت پڑنے کی کوشش کریں اور ان کے

ایسے احکامات سے آگاہ کریں جو مسلمانانہ تہذیب کے تقاضا ہوں اور ان کے ان کی حکم عدول کی انتظام کیسے ہو

### ادارہ

۱۰۔ اس جماعت کا ایک امیر ہوگا جس کی حیثیت امیر مومنین و باطنی مریدان کی نہ ہوگی بلکہ وہ اس جماعت کے



رہنما کی ہوگی۔ اس کی اطاعت فی المعروف جماعت کے کل افراد اپنے امیر (با صلابت شرعی) کی حیثیت کریں گے۔ امیر کے انتخاب میں تقویٰ، علم دین میں بصیرت، اصابت رائے، غم و حرم اور مفاد جماعت کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ جماعت کی نظر میں انتخاب کے وقت جو شخص بھی مذکورہ بالا اوصاف کے لحاظ سے اہل تر ہوگا اس کو وہ اس منصب کے لیے منتخب کرے گی۔

امیر کی خدا ترسی و احساس ذمہ داری سے یہ توقع کی جائے گی کہ اپنے سے زیادہ اہل آدمی کے آجانے پر وہ خود اس کے لیے جگہ خالی کر دے گا۔ نیز ایسی صورت میں جبکہ جماعت اپنے نصب العین کے مفاد کے لیے ضرورت محسوس کرے، وہ امیر کو معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

## ابتدائی لائحہ عمل

۱۱۔ جماعت کا ابتدائی پروگرام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک طرف اس میں شامل ہونے والے افراد اپنے نفس اور اپنی زندگی کا ترکیہ کریں، اور دوسری طرف جماعت سے باہر جو لوگ ہوں (خواہ وہ غیر مسلم ہوں یا ایسے مسلمان ہوں جو اپنے دینی فرائض اور دینی نصب العین سے غافل ہیں)، ان کو بالعموم حاکمیت غیر اللہ کا انکار کرنے اور حاکمیت رب العالمین کو تسلیم کرنے کی دعوت دیں۔ اس دعوت کی راہ میں جب تک کوئی قوت حائل نہ ہو، ان کو چھپر چھاڑ کی ضرورت نہیں۔ اور جب تک قوت حائل ہو، خواہ وہ کوئی قوت ہو، تو ان کو اس کے علی الرغم اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنی ہوگی اور اس تبلیغ میں جو مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔

بعد کے مراحل کے متعلق اس وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جیسے حالات پیش آئیں گے انہی کے لحاظ سے قدم اٹھایا جائے گا۔ البتہ لوگوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مضبوط جہے ہوئے اور زمین پر چھلے ہوئے دین (نظام اطاعت غیر اللہ) کو اکھاڑ کر دوسرے دین (نظام اطاعت الہی) کو قائم کرنا بہر حال آسان کام نہیں ہے۔ اس میں جان، مال اور ہر چیز کا زیاں ہے، لہذا وہی لوگ آگے بڑھیں جو تمام فائدوں اور آسائشوں کی قربانی اور تمام نقصانات کی برداشت کے لیے تیار ہوں۔



# مسلمانان موجودہ دنیا اور سیاسی کشمکش

## حصہ اول

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانان ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلا کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔

## حصہ دوم

اس حصہ میں ہندوؤں کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اس وقت تک ملک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کوئی بالیدہ اختیار کرنی چاہیے۔ اس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے۔

### حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے اور ان اصولوں پر جس قدر اعترافات و شہادت کئے جا سکتے ہوں، ان کا جواب کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	ملاحظہ
پے جلد ۱-۰۰-۱	پے جلد ۲-۸-۰۰	پے جلد ۱-۱۲-۰۰	محصول قاک

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دارالاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)



# TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

This small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. The chief aim in view has been to present within a brief space the most systematic and logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of human life on the basis of this conception and to give a comprehensive and lucid account of what this religion in reality is.

All the prominent journals and Dailies of India have highly spoken of this little book. Order your copy just now. Price 2/8/-. Available from The Manager, Tarjuman-ul-Quran, Jamalpur F. F., District Gurdaspur.

## رسالہ دینیات

رسالہ دینیات | یہ رسالہ مائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید سہارا اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ سالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ ہمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اصول شرعیہ کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانہ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس سالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ سالہ انکو تباہ نگاہ سے اس دین اسلام کو پیش کرنے کا صحیح طریقہ کیسے

قیمت ۱/۳۰ محصول لڑاک ۲۰ خرچ وی پی ۳۰

دفتر رسالہ ترجمان القرآن، جمال پور۔ پتہ لاہور

یہ کتاب اس کافذ پر طبع ہوئی ہے جو ہمیں بحسن نعاران ایم ثناء اللہ خان

بک سولر پبلشر۔ لاہور حاصل ہوا۔

مرکلتائیل پرہس لاہور میں چھاپی



